سلسلہ ستم ظریف بک ڈپو لاہور نمبر ۲

تذکرہ

اعجاز سخن

(حصہ اول)

من تالیفات و تصنیفاتِ

خاکپائے شعراء شیر علیخاں سرخوش

سرورق بصرف روڈری پرنٹنگ ورکس لاہور میں باہتمام لالہ بہارام پرنٹر کے چھپا

قیمت

خاص مضامین تذکرہ اعجاز سخن

مضامین	صفحہ
دیباچہ	اوراق ابتدائی
اُردو زبان کی صحیح تاریخ	ا
اُردو ریختہ کی اصلیت	ف
اصول شاعری	۱ - ۸
موضوع شعرگوئی	۸ - ۱۲
استعداد شاعری	۱۳
استفادہ حالات اکابر الشعرا	۱۷
صاحب ایجاد شعرا - تذکرہ	۶۵
اساتذۂ نظم اردو	۲۹۷
فہرست منظوم تصنیفات (ضمیمہ)	۳۳۷
نقشۂ تعلقات اردو زبان	یے
امیر خسرو - خالق باری	ع
اردو نظم میں پنجابی عنصر	ص

استفاضۂ حالات و کلام اکبر الہ آبادی	۱۸
ایضاً عبدالغفور شہباز	۲۵
ایضاً حالی	۴۲
ایضاً شبلی	۵۸
تذکرہ امیر خسرو	۶۹
تذکرہ قطب شاہ دکنی	۸۳
تذکرہ جعفر زٹلی (موجد اردو ہجوگوئی)	۹۹
تذکرہ دلبیر (ٹھیٹھ پنجابی و اردو شاعر)	۱۰۶
تذکرہ خواجہ میر درد	۱۲۰
تذکرہ میر تقی میر	۱۲۵
تذکرہ محمد رفیع سودا	۱۳۷
بحث گلزار نسیم	۱۵۳
بیان مثنوی سحر البیان	۱۶۰
تذکرہ انشاء اللہ خاں	۱۶۱
تذکرہ سعادت یار خاں رنگین	۱۸۴
تذکرہ شیخ ناسخ	۱۹۱
تذکرہ آتش	۱۹۷
تذکرہ ذوق	۲۱۴
تذکرہ غالب	۲۴۰
تذکرہ مومن	۲۹۵
ضمیمہ میں مختلف شعرا کا	۲۶۷

دیباچہ

محققین علوم مغربی کا یہ عام دستور ہے کہ وہ کسی لٹریچر سائنس یا فلسفہ کو بہ نظر امعان مطالعہ کرتے ہیں۔ تو اس میں جس قدر رطب و یابس متحقق ہوتے ہیں۔ وہ ان کو ایک سلیقے سے وقتاً فوقتاً سپرد قلم کرتے رہتے ہیں۔ پھر ان کو استفادہ عام کی غرض سے کسی مناسب ترتیب کے ساتھ شائع کر دیتے ہیں۔ چونکہ اردو علم ادب۔ زبان اور شاعری کی موجودہ بہترین تحقیقات ہمیں اسی طرح آزادؔ حالیؔ اور شبلیؔ کی مساعی جمیلہ سے بہم پہنچی ہیں*۔ میں ان واجب التعظیم بزرگوں کا خاکپا ہمیشہ انہی کے نقش قدم پر چلنا۔ اپنے لئے موجب فخر خیال کرتا ہوں کتاب تذکرہ آب حیات میں تاریخ زبان اردو کو اس عہد سے جب یہ زبان دلّی اور دکن پہنچی تھی) بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ اور قدیم غزلگو شعرا کے حالات بھی متعدد

* ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹

دوروں میں قلمبند ہوئے ہیں۔ لہٰذا نظم اردو کی عہد بعہد کی ترقیاں اور تبدیلیاں بڑی خوش اسلوبی سے واضح کی جا چکی ہیں اسی طرح مولانا حالی نے اپنے دیوان کے بےمثل مقدمے میں اُردو شاعری کی حقیقت شعر گوئی کے اصول اور شعرا کے لئے بعض عملی ہدایات بڑی قابلیت سے جمع کی ہیں۔ دور آخر میں مولانا شبلی نے موازنہ انیس و دبیر کو لکھکر نظم اُردو کا معراج کمال گویا کلام انیس کی صورت میں پیش کیا ہے۔ میں ان مستند اور معرکۃ الآرا تصانیف کے علاوہ سینکڑوں اور منظوم تصنیفات۔ ادبی رسالہ جات شعرا کے تذکروں اور تاریخ زبان و علم معانی و بیان وغیرہ کی کتابوں کو بغور مطالعہ کر چکا ہوں۔ لہٰذا اس تحقیق و تلاش میں مجھے بھی جو جو ادبی نکات ہاتھ آئے اب انکو حوالہ قلم کرتا ہوں ؎

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

خلاصہ حقیقت یہ ہے کہ تذکرہ آب حیات سے مجھ کو اس امر میں خاص طور پر اختلاف ہے کہ اس کے قابل مصنف نے پنجابی زبان کی اہمیت اور زبان اُردو کے ساتھ اس کا جو آبائی

تعلق ہے اس پر کما حقہٗ توجہ نہیں کی۔ حالانکہ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی ابتدا ایک ہی ہے اور شروع شروع میں اردو پنجاب ہی میں پیدا ہوئی۔ یہ صوبہ ایک وسیع مردم خیز قطعہ[۱] ہے۔ بلکہ اب بھی سارے ہندوستان کا بہترین ملکی اور نیچرل شاعر ایک پنجابی[۲] ہے۔ اور سب سے زیادہ اُردو زبان کے ادبی رسائل واخبارات اسی خاص علاقہ ہندوستان سے شائع ہوتے ہیں۔ پنجاب کی آب وہوا بھی اس قدر متنوع ہے کہ اہل پنجاب تمام دنیا کی زبانیں بخوبی بول سکتے ہیں[۳]۔ اس کے علاوہ ایک

[۱] راجہ ٹوڈرمل جو اکبر کا وزیر تھا اور آئین اکبری کا مصنف وہ ایک پنجابی کھتری تھا۔ شاہجہان کا قابل وزیر سعد اللہ خان بھی چنیوٹ (پنجاب) کا رہنے والا تھا۔ اسی طرح فارسی۔ عربی کی بعض بہترین تصنیفات مثلاً بہار دانش مثنوی غنیمت اور عربی رسائل عبدالحکیم سیالکوٹی وغیرہ اہل پنجاب ہی کے قلم سے نکلی تھیں۔ سو قت فارسی اردو میں ڈاکٹر اقبال اور انگریزی صحافت میں سنت نہال سنگھ دونوں بمثل پنجابی ادیب ہیں۔ جن کی تمام ادبی دنیا معترف ہے۔ مرزا شاہ وحید کوی بھی لاہوری تھا۔

[۲] ڈاکٹر سر محمد اقبال [۳] زبان کو آب وہوا سے قدرتی تعلق ہوتا ہے

سائنسی دلیل صوبہ پنجاب کے مردم خیز ہونے کی یہ ہے کہ انسان کی بہترین غذا گیہوں[1] ہے جو ہمارے دماغ کو بیحد تقویت پہنچاتی ہے اور وہ اہل پنجاب کے روزمرّہ استعمال کی چیز ہے۔ غرض کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک خاص مشرقی زبان جیسے کہ اردو ہے۔ اس ملک میں پیدا نہ ہوئی ہو؛ ہاں بیشک ہوئی ہے اور قدیم اسلامی تاریخیں؛ شعرا کے تذکرے اس کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد نے زبان اردو کی تاریخ سے اپنے تذکرہ آب حیات کی ابتدا کی ہے۔ میں بھی اس تذکرہ میں اسی کے قدم بقدم چلکر اپنے نتائج خیال اخذ کرتا ہوں۔

علاوہ ازیں بعض قدیم اردو شعرا کے حالات کے متعلق مجھکو مصنفِ آب حیات سے کچھ اختلاف ہے اس لئے ان کو مع اسناد یہاں تحریر کرتا ہوں۔ چونکہ اردو زبان اب محض ہندوستان کی چاردیواری تک محدود نہیں رہی بلکہ اسکو دنیا بھر کی قوموں سے واسطہ پڑتا ہے یا پڑا ہے اسلیے ایک نقشے میں اردو زبان کے تمام عالمگیر تعلقات کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

[1] گیہوں کھانیوالی قوموں کا برین میٹر (دماغی مواد) بہت زیادہ وزنی ہوا کرتا ہے۔

اس کتاب میں شعرائے اُردو کے مخصوص دور قائم نہیں رکھے گئے بلکہ ان کے دو درجے مقرر کئے گئے ہیں جن میں ایک تو صاحب ایجاد شعرا کا ہے کہ جن سے کوئی خاص قسم کی شاعری یادگار یا ان کے کلام سے اور شعرا عموماً مستفاد ہوتے رہے ہیں اور ان کے دواوین اشعار وغیرہ کو قابل تقلید خیال کیا گیا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اپنے زمانہ میں کچھ زیادہ مشہور ہوئے یا نہیں ہوئے۔

اسی طرح دوسرے درجہ کے شعرا میں وہ خاص اساتذہ شامل ہیں جو اگرچہ صاحب ایجاد نہیں ہیں۔ مگر وہ نظم اردو کی عام تقویت کا خاص باعث ہیں۔

مولانا حالی نے جب اپنا مقدمہ دیوان مرتب کیا تھا۔ تو اسوقت تک اخلاقی۔ نیچرل اور مسلسل شاعری کا دور دورہ نہیں ہوا تھا۔ اور خواجہ صاحب موصوف کے سامنے اردو شاعری کا معیار کمال عموماً پریشان گوئی یا عشقیہ غزل ہی تھی۔ مگر اب اُردو شاعری کا موضوع بدل چکا ہے جو مسلسل اخلاقی نظمیں ہیں

لہذا جو قواعد و اصول اپنے دیوان کے مقدمہ میں مولانا حالی نے نیچرل شاعری کے متعلق تحریر کئے تھے۔ میں ان میں سے بعض کو یہاں مختصراً درج کرتا ہوں اور ان کے علاوہ کچھ اور بھی علم بیان و معانی یا مختلف تصنیفات (متعلق بہ شعر و شاعری) سے مستعار لے کر اس غرض سے اُن کو پیش کرتا ہوں کہ ہمارے آجکل کے شائقین ادب، (جن میں بعض فارغ التحصیل طلبا بلکہ گریجوایٹ شعرا بھی شامل ہونگے) شعرگوئی میں ان علمی اصولوں سے کچھ مدد لے سکیں۔ اردو شاعری کے ان جدید اصولوں پر اگر غزل گو شعرا متوجہ ہوں تو ان کو اپنی اصلاح حالت کرنے یا مسلسل اخلاقی نظمیں لکھنے کی طرف ایک میلان طبع ضرور پیدا ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ ان کی ادبی کوشش آئندہ کچھ بارآور ثابت ہوں اور ان میں سے اکثر شعرا اپنے لئے کوئی خاص میدان عمل منتخب کرسکیں۔

آجکل مرزا غالب کی رنگینیٔ کلام اور اس کی دقت پسندی کی بالعموم تقلید کیجاتی ہے مگر ایک اخلاقی یا نیچرل

شاعری کے لئے وہ بالکل غیر موزوں ہے اور بہت کم شعرا
اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میرزا موصوف کے
متعلق اس تذکرہ میں مفصل بحث کی گئی ہے۔ آخر کتاب
میں منظوم تصنیفات۔ تذکروں اور کتب بیان و معانی
وغیرہ کی ایک مکمل فہرست بھی دیدی گئی ہے تاکہ اردو گو
شعرا کو حصول فن میں کچھ دقت واقع نہ ہو اور عام شائقین
نظم بھی اُردو زبان کی موجودہ بہترین منظوم تصنیفات سے
کما حقہ واقفیت حاصل کر سکیں۔ امید ہے کہ میری یہ
ناچیز کوشش رائگاں نہیں جائیگی۔ اور اس تذکرہ کی
بعض جدّت طرازیوں کی محض وسعتِ ادب کی نگاہ سے
ضرور قدر کی جائے گی۔ ورنہ میں اپنے دل میں مطمئن
ہوں کہ ایک کام جو میری بساط سے بہت بڑھکر تھا۔
آخر ایک بڑی بھلی صورت میں سرانجام کو پہنچا ہے۔ اور یہ
مصرعہ میرے حسبِ حال ہے ؎

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

(نوٹ) تذکرہ ہذا میں جتی الوسع عشقیہ غزلیں انتخاب نہیں کی گئیں ؂

فہرست اساتذہ نظم اردو مندرجہ تذکرہ ہذا

تخلص شاعر — صفحہ

ا
- اکبر — ۱۸
- اثر — ۳۱۱
- انشا — ۱۷۱
- امیر مینائی — ۲۴۳
- آبرو — ۳۰
- اسیر — ۳۳۸
- امیر خسرو — ۴
- آزادہ — ۳۲۵
- امانت — ۳۲۸
- احسان — ۳۱۸
- احسن — ۳۰۳
- آتش — ۹۷
- آرزو — ۲۹۸

ت
- تاباں — ۳۰۶

ث
- ثاقب — ۳۳۰

ج
- جرأت — ۳۱۲
- جعفر زٹلی — ۹۹

چ
- چکبست — ۱۵۳

ح
- حامد — ۹۲
- حالی — ۴۲
- حسن — ۱۶۴
- حاتم — ۲۹۷
- حسرت — ۳۱۰

خ
- خلیل — ۳۲۲
- خسرو — ۶۹

د
- داغ — ۲۴۱
- درد — ۱۲۰
- دلگیر — ۱۰۳

ذ
- ذوق — ۳۱۴

ر
- رند — ۳۲۰
- رشک — ۳۳۹
- رنگین — ۱۸۴

س
- سرور — ۱۹۵
- سودا — ۱۳۷
- سالک — ۳۲۶
- سوز — ۳۰۹
- سراج — ۲۹۸

ش
- شوق — ۳۳۴
- شیفتہ — ۳۲۶
- شہیدی — ۳۱۷
- شہباز — ۲۵
- شبلی — ۵۸

ص
- صبا — ۳۲۱

ض
- ضاحک — ۳۱۰

ظ
- ظفر — ۳۲۴

ع
- عیش — ۳۲۱

غ
- غالب — ۲۴۰

ف
- فغاں — ۳۰۵

ق
- قطب شاہ — ۸۳
- قلق — ۳۲۲
- قائم — ۳۰۱

گ
- گویا — ۳۲۷

م
- مومن — ۲۹۵
- منت — ۳۱۷
- معروف — ۳۱۹
- میر — ۱۲۵
- ممنون — ۳۱۷
- مصحفی — ۳۱۵
- مجذوب — ۳۱۱
- مظہر جانجاناں — ۳۰۴
- مہر — ۳۳۵
- مضمون — ۳۰۲

ن
- ناسخ — ۱۹۱
- نسیم — ۱۶۵
- نظیر — ۱۰۶
- ناظم — ۳۳۸
- نصیر — ۳۱۳
- نعیم — ۳۰۲
- نواب — ۳۳۹
- ناجی — ۳۰۳

و
- وزیر — ۳۱۹
- ولی — ۹۴

ہ
- ہوس — ۳۳۲
- ہدایت — ۳۱۱

ی
- یکرنگ — ۳۰۴

اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمۃً وَّاِنَّ مِنَ البَیانِ لَسِحراً

اعجازِ سخن

تاریخِ زبانِ اردو

اُردو زبان کی اصلیت اور اس کی وجہ تصنیف عموماً یوں بیان کی گئی ہے کہ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو وہ عربی۔ فارسی۔ ترکی زبانیں بولتے تھے۔ ادھر ہندوؤں کی عام زبان ہندی یا بھاکھا تھی۔ اس لئے جب ان دونوں قوموں کا میل جول روز بروز بڑھنے لگا۔ تو شاہجہان آباد یعنی نئی دلّی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ زبان بنام "اردو" پیدا ہوئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ زبان اردو نے قریب قریب اسی طرح جنم

لیا ہے۔ مگر اس اصولِ موضوعہ کی علمی تشریح اور مفصل توضیح کرنے میں "صوبہ پنجاب" جہاں سب سے پہلے ہندؤں اور مسلمانوں کا اتصال ہوا۔ اور جہاں فاتح مسلمانوں نے دہلی یا ہندوستان کیطرف قدم بڑہانے سے قریباً دو سو برس پیشتر مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ اسکی اہمیت اور اردو زبان سے اس کے ابتدائی تعلق کو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے[1]۔

لہذا اردو زبان از روئے تاریخ جس طرح پیدا ہوئی۔ یا اس کے اوّل اول وجود پذیر ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ اسکو ہم مختصراً بسطور ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

اہل اسلام دو طرف سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے ایک تو سندھ کی جانب جو عرب تھے وہ اگرچہ بہت زیادہ دیر نہیں رہے۔ تاہم عربی زبان کے بعض الفاظ ان کی اس قلیل اقامت کے باوجود

---

[1] سلطان سبکتگین نے ۹۸۸ء کے قریب پنجاب کا ایک حصہ فتح کیا۔ اور پھر سلطان محمود نے حملے کئے اور غزنویوں کی حکومت پنجاب پر ۱۱۹۲ء تک یعنی قریباً دو برس تک برابر جاری رہی ✣

بھی سندھی زبان میں پائے جاتے ہیں۔

وہ دوسری طرف جس سے مسلمانوں نے ہندوستان پر حملے کئے۔ سرحد پنجاب کے کوہستانی علاقہ جات ہیں۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کا سب سے پہلا تصادم ۹۷۷ء میں سلطان الپتگین کے عہد میں ہوا تھا۔ مگر جب الپتگین وفات پاگیا تو سبکتگین نے ۹۸۸ء میں جیپال والیٔ پنجاب کو شکست دی۔ اور پھر لاہور میں اپنی مستقل حکومت قائم کی۔

خاندانِ غزنویہ کی یہ حکومت شہر لاہور میں (جو صوبہ پنجاب کا ہمیشہ دارالسلطنت رہا ہے) ۹۸۸ء سے ۱۱۹۲ء تک برابر رہی۔ پھر خسرو ملک جو اسی خاندان کا آخری بادشاہ تھا ۱۱۹۲ء میں قتل کر دیا گیا۔ اور سلطنتِ خاندانِ غور قیام پذیر ہوئی۔

حکومتِ غزنویہ کے حالات سے پایا جاتا ہے۔ کہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد نے اسی عہد سلطنت میں مذہب۔ اسلام قبول کیا تھا۔ اور وہ نومسلم خاندان

عموماً پنجاب ہی میں آباد ہوئے تھے۔ بلکہ پنجاب ہی کے ہندوؤں نے اوّل اوّل اسلامی شعار اور ایک اسلامی معاشرت اختیار کر لی تھی۔ انہی سے سرحدی مسلمانوں کے وہ گروہ جو بحیثیت فاتح ..... یہاں وارد ہوئے تھے۔ اور وہ ترک افغان اور ایرانی وغیرہ تھے۔ لین دین کے معاملات اور ان ہی روز بروز آمیزش کرتے جاتے تھے اور ایسے ہی لوگوں کو سب سے اوّل اور ایک ایسے ہی ملک یعنی پنجاب میں ایک ہندی و فارسی الفاظ سے مرکب زبان یعنی ریختہ یا اردو کے بولے جانے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ چنانچہ آزاد آبحیات[1] میں لکھتا ہے۔ کہ یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی اور ہندوؤں سے ہندی الفاظ ملا جلا کر گزارہ کر لیتے تھے۔ پھر آگے چلکر لکھا ہے۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا آٹھ پہر ایک جگہ رہنا سہنا۔ لین دین کرنا۔ وہ لفظوں کے

[1] ملاحظہ ہو آب حیات صفحات ۱۲ - ۱۳

بغیر کیسے گزارہ کر سکتے - چنانچہ باہم اختلاط ہوا - اور ایسا ہونا ناگزیر تھا -

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اختلاط کہاں ہوا تھا - اس کا جواب یہی ہے کہ پنجاب میں - اب اس کے متعلق مرقومہ ذیل تاریخی واقعات پر بھی غور کرو - جو اسی امر کی تائید مزید کرتے ہیں -

سلطان محمود غزنوی کی وفات کے بعد جانشینانِ محمود میں سے سلطان مسعود اور پھر مودود وغیرہ نے حکومت کی - مگر ان کی حکومت اس قدر کمزور تھی کہ سلجوقی ترکوں نے اُن کو خراسان اور غزنی وغیرہ کے علاقوں سے کلیۃً بے دخل کر دیا تھا - لہذا وہ مجبور ہو کر پنجاب ہی میں رہ پڑے تھے - اور چونکہ اُن کے آبا و اجداد غلاموں کی حیثیت سے بادشاہ ہو گئے تھے - انہوں نے اپنی محدود حکومت کو مغتنم سمجھا - اور اہل ہنود پر کسی قسم کا کوئی تشدّد نہیں کیا - انجام یہ ہوا کہ ہنودِ پنجاب بکثرت مسلمان ہو گئے اور ان سے سرحدی مسلمانوں نے مل جُل کر ایک زبان استعمال

کرنا شروع کی جو پہلے تو پنجابی پراکت[1] کہلاتی تھی - مگر اس میں فارسی - ترکی - عربی کی آمیزش ہو کر یہ ریختہ بن گئی۔

چنانچہ تاریخ الفنسٹن میں جو بعض اسلامی تاریخوں ہی کا خلاصہ ہی اور اس کا ترجمہ علیگڈھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے کرایا تھا- اس کے صفحہ ۵۲، میں صاف لکھا ہے - کہ سلطان مودود جو محمود غزنوی کا پوتا تھا - اسی کے عہد میں پنجاب کے ہندو اور سرحدی مسلمانوں کو باہم معاشرت رکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس وقت نو وارد مسلمانوں نے ہندوؤں کے بہت سے طور و طریق اختیار کر لئے - اور ان کی عام سمجھ بوجھ میں بھی ایک بڑا تغیر واقع ہو گیا - اور صوبہ پنجاب میں ایک نئی زبان جسے اردو کہتے ہیں - بالعموم رائج ہو گئی - چونکہ مودود نے ۱۰۴۹ء تک سلطنت کی تھی - یہ اردو گویا اسی سن و سال میں یہاں

---

[1] زبان سنسکرت کے زوال پر ہر جگہ پراکرتیں پیدا ہو گئی تھیں چنانچہ صوبہ پنجاب میں ایک پنجابی پراکرت رائج ہوئی تھی۔

جاری ہوئی تھی لیکن اس امر واقعہ کے متعلق مورخوں کو کچھ دھوکا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ زبان جو یہاں نئی رائج ہوئی تھی درحقیقت اردو نہیں تھی۔ بلکہ وہ قدیم پنجابی زبان تھی۔ جو اس طرح سے بنی تھی کہ رائج الوقت پنجابی پراکرت یعنی ہندی زبان میں ترکی۔ عربی اور فارسی الفاظ بکثرت مل گئے تھے۔ اور ایک زبان محض بول چال کے لئے وضع ہو گئی تھی جسے بعد کو پنجابی زبان کہا گیا۔ اور جو عہد برطانیہ سے پہلے تک لکھنے پڑھنے میں کبھی نہیں آئی اور اب بھی اہل پنجاب باہمی گفتگو کرتے ہیں خط وکتابت نہیں کرتے لہذا اردو زبان کی نہایت ابتدائی شکل و صورت پنجابی ہی ہے۔ جس کے مزید ثبوت کے لئے صفحاتِ آیندہ کو مطالعہ کرنا چاہیے

زبانِ اُردو اور اہلِ پنجاب

چہ پنجاب انتخابِ ہفت کشور　　قسم خوردہ بہ خاکش آبِ کوثر

حقیقت میں پنجاب ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں سرد و گرم۔ خشک و مرطوب۔ میدانی اور کہستانی ہر قسم کی آب و ہوا موجود پائی جاتی ہے۔ پس اگر اختلاف آب و ہوا کو کسی قوم کی قوتِ لسان و بیان سے کچھ تعلق ہو سکتا ہے تو اس وجہ سے اہل پنجاب تمام دنیا کی زبانیں بجنسہٖ بولنے کی پوری پوری استعداد رکھتے ہیں۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ جب ترک۔ ایرانی۔ عرب اور اہل سرحد وغیرہ مختلف اسلامی قومیں بکثرت یہاں در آئی ہونگی۔ تو ان کی بھانت بھانت کی بولیوں پر پنجابیوں ہی کے گلے حاوی ہوئے ہونگے۔ خصوصاً غزنی اور کابل وغیرہ کی فارسی اور پشتونیوں کی سخت اور کرخت زبانیں جب یہاں بولی جاتی ہونگی تو اہل پنجاب ان کو اسی طرح سمجھنے کی کوشش کرتے ہونگے۔ جیسے کہ انگریزوں کے آنے پر ہماری چھاونیوں کے خانسامے بہرے عام یورپین لوگوں کی بولیوں کو اپنے کانوں سنکر پہلے کچھ غلط سلط انگریزی الفاظ بولنے لگے پھر وہی تیر صحیح الفاظ ملک میں رائج

[1] مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی عنایت اللہ مصنف بہار دانش اللہ غنیمت گنجاہی پنجابی ہی تھے آجکل سنت نہال سنگھ انگریزی۔ ڈاکٹر اقبال فارسی اور شیخ شادی ترکی و عربی زبانوں کے جتنے عالم [illegible]

ہو گئے - اسی طرح جب سرحدی افغان آمدہ ایست - دادہ ایست - یا کردہ ایست وغیرہ بولتے ہونگے تو اہل پنجاب ان کو آوندہ اے - وینده اے - کردہ اے وغیرہ سمجھ[1] لیتے ہونگے - اور یہ سب الفاظ خالص پنجابی ہیں -

پھر جب آوندہ اے سے آوتا ہے بنا - تو یہ دکن میں استعمال کیا گیا - آخر دلی میں مزید اصلاح ہو کر یہ آتا ہے بن گیا - اور اسی طرح اُن دوسرے پنجابی الفاظ سے کرتا ہے اور دیتا ہے وضع کئے گئے -

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ بوجہ اختلاف آب و ہوا - اہل پنجاب ہر قسم کی زبان بولنے کی کما حقہ قابلیت رکھتے ہیں[2] چنانچہ ان کی طاقت گویائی یا ان کے وسیع المخرج ہونے کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ ایک گھسنے کے لفظ کو پنجاب کے لوگ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں کی مانند بخوبی بول سکتے

[1] بہ حوالہ ایشیائی شاعری مصنفہ مولینا اشہری صفحہ ۶۹

[2] یہ ایک سائنٹفی مسئلہ ہے کہ زبان کی قدرت اختلاف آب و ہوا پر منحصر ہے -

ہیں حالانکہ اس لفظ کو اہل دہلی و لکھنو کا لب و لہجہ ہرگز ویسا ادا نہیں کرسکتا ۔ ملاحظہ ہو آب حیات صفحہ ۲۱

غرض فارسی زبان کو جب سلطان محمود غزنوی کے دو[۲] وزیروں حسن بن مہمندی اور محمد عباس نے جب اہل لشکر میں رائج کیا ۔ اور پھر وہ اس کے اہل دربار میں بھی رائج ہو گئی ۔ تو پنجاب فتح ہو کر سب سے پہلے فارسی کا قدم ہندوستان میں یہیں پڑا ۔ اور یہ جانشینان محمود کے دربار کی بھی زبان قرار پائی پھر غوریوں اور ترکوں وغیرہ نے اسے اختیار کیا ۔ علیٰ انتہا سرکار انگریزی کی ایسٹ انڈیا کمپنی تک یہ ہندوستان کی شاہی اور درباری زبان بنی رہی ۔ مگر جب محمد غوری نے پنجاب پر حملہ کیا تھا تو سب سے پہلے ایک پنجابی ہندو شاعر چندر کوی ہی نے کچھ فارسی الفاظ اپنی ایک ہندی نظم پرتھی راج

[۲] سلطان محمود غزنوی نے خراسان فتح کیا ۔ تو حسن بن مہمندی اور محمد عباس دو ایرانیوں کو اپنا وزیر مقرر کیا ۔ انہوں نے اپنی سہولیت کے

راسہ میں ملا جلا کر استعمال کئے تھے۔ وہ فارسی الفاظ پاتشاہ۔ پگام۔ پھرمان اور سلام وغیرہ ہیں۔ جواب بھی اسی طرح زبان پنجابی میں رائج چلے آتے ہیں ؎۳۔ گویا فارسی گو سب سے پہلے پنجابیوں ہی نے

لبیک کہا نہ کہ ٹوڈرمل نے جو غلط ہے۔ ملاحظہ ہو دیباچہ تذکرہ گلشن ہند صفحہ ۴۔

اہلِ زبان کی پنجابی زبان سے ناواقفیت

باوجودیکہ اردو زبان کا جہاں تک تعلق تاریخ سے ہے اس کا حدوث صوبہ پنجاب ہی میں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ سب سے پہلے یہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل جل کر ایک بول چال قائم کرنی پڑی تھی۔ مگر اہلِ زبان اس امر کی طرف کبھی متوجہ ہی نہیں ہوئے۔ کیونکہ ان کے دل و دماغ میں محققین ادب اردو نے یہ بات بٹھا رکھی ہے کہ ہر زبان کا آغاز نظم سے ہوتا ہے۔ اور چونکہ اردو نظم سب سے پہلے دلی میں تصنیف

(بقیہ حاشیہ) لئے فارسی کو اس کے دربار کی زبان قرار دیا ؎۳ ملاحظہ ہو آب حیات صفحہ ۱۴۔

ہوئی تھی۔ لہذا اردو بھی دہلی ہی میں پیدا ہوئی۔ مگر یہ اصول ہی سرے سے غلط ہے۔ کیونکہ کوئی زبان بھی پہلے پہل نظم سے آغاز پذیر نہیں ہوتی۔ بلکہ نثر سے۔ اور نثر میں اول اول ...

... مفرد الفاظ جمع کیے جاتے ہیں۔ پھر ان سے ایک سیدھی سادی بول چال قائم ہوتی ہے چنانچہ اسی طرح زبانِ اُردو کی ابتدا ہوئی۔ کہ پہلے پنجاب میں اس کے لئے مفرد الفاظ فارسی ہندی۔ اور عربی۔ ترکی وغیرہ زبانوں سے منتخب کئے گئے پھر وہ ایک پنجابی بول چال کی صورت میں اولاً پنجاب میں رائج ہوئی مگر جوں جوں مسلمانوں کی حکومت پنجاب سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ پنجابی یا خاص ہندی بول چال بھی آخر دلی اور دکن تک پہنچکر وہاں مستعمل ہونے لگی۔ اور وہاں سورسینی اور برج کی بھاشا یا دیگر مقامی اثرات سے اس قدر تغیّر پذیر ہو گئی کہ اُردو اور پنجابی میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا۔ اور اہل زبان پنجابی کو اردو سے بالکل ایک غیر متعلق زبان تصور کرنے لگے چنانچہ ۱۸۴۳ء کے قریب مولینا صہبائی نے جب اردو زبان کے قواعد مرتب

کیے۔ تو اس زبان کی تاریخ میں یہ بھی لکھدیا۔ کہ نامعلوم دستا کونسا لفظ ہے۔ جو ولی نے متواتر استعمال کیا ہو شاید یہ کوئی دکنی لفظ ہوگا۔ یہ بات مولانا موصوف کی لاعلمی کی دلیل ہے۔ کیونکہ دستا خاص پنجابی لفظ ہے۔ جو ابتک یہاں مستعمل ہے۔ اور ولیؔ نے اس کو پنجابی زبان ہی سے مستعار لیا ہے۔ جبکہ یہ زبان پہلے لاہور سے دلی اور پھر دلی سے دکن پہنچی تھی چنانچہ ولیؔ اپنے دیوان میں لکھتا ہے ؎

یہ تل تجھ مکھ کے کعبے میں مجھے اسود وحجر دستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہ زمزم کا اثر دستا

اسی طرح تذکرہ شعرائے دکن[1] میں لکھا ہے کہ ولیؔ نے بعض خاص الفاظ نظم کیے ہیں جو دکن سے مخصوص ہیں مثلاً ست دیا۔ چھڈ دیا۔ اور کیتا وغیرہ۔ یہ سب الفاظ

(حاشیہ صفحہ ۱۲) [1] ملاحظہ ہو۔ اردو لغت و اردو قواعد مولانا صہبائی دہلوی۔

[2] مرزا انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں پنجابی کو اردو کا ایک کن بتاتے ہیں ملاحظہ ہو صفحہ ۱۸۲

[1] تذکرہ دکن مولفہ عبدالجبار ملکاپوری

بھی پنجابی ہیں۔ اور نین۔ مکھہ۔ بچن۔ سرجن۔ لٹ پٹی دستار اسوار۔ بسر کر (بھول کر) اور بھواں۔ پلکاں وغیرہ۔ یہ سب ہندی الفاظ ہیں جو پہلے پنجابی پراکرت میں مستعمل تھے۔ پھر فارسی کے ساتھ مل کر دکن پہنچے اور ولی نے ان کو اپنے اشعار میں استعمال کیا۔

سب سے زیادہ پنجابی زبان کی اصلیت سے ناواقفیت کا اظہار مولینا محمد حسین آزاد نے کیا ہے جو باوجودیکہ برسوں پنجاب میں رہے مگر پنجابی کو اردو زبان سے بالکل غیر متعلق بتاتے رہے۔ چنانچہ آب حیات میں ایک جگہ لکھتے ہیں[1] کہ چٹا کھبا پنجابی ہے۔ مگر ہم چٹا بغیر گورے کے اور چنگا بغیر بھلے کے نہیں بولتے۔ لیکن ایک قدیم اردو چیستاں روپیہ کے متعلق ہے ؎

چٹا چٹا اُبلا دودھ بھی تو نہیں

[1] ملاحظہ ہو آب حیات صفحہ ۲۰ - ۲۱

چار اس کے پائے پلنگ بھی تو نہیں
بھاڑی اس کا لشکر راجہ بھی تو نہیں

یہاں چٹا مفرد استعمال ہوا ہے - اور چنگا بھی مثل پنجابی کے اردو میں پہلے مفرد ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ خاکسار دہلوی کا ایک شعر میر تقی نے نکات الشعرا میں نقل کیا ہے ؂

روانے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی
اس عشق کے مریض کو چنگا خدا کرے

اصطلاح "روپیہ بھنا لاؤ" - اس کی اصل آزاد نے فارسی کا محاورہ خوردہ کردن لکھی ہے - مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ پنجابی میں کہتے ہیں کہ جاؤ روپیہ بھنا لاؤ - اسی سے بھنا لاؤ بن گیا ہوگا -

اردو اور پنجابی زبان کی مماثلت

ہم اوپر تاریخ سے واضح کر چکے ہیں کہ اردو زبان جہانتک

؎ ملاحظہ ہو اردو پہیلیاں مؤلفہ چرنجی لال دہلوی -

اسکا ابتدائی بول چال سے تعلق ہے پنجاب ہی میں پیدا ہوئی تھی
اب قدیم اردو زبان میں جن مصنفوں نے کچھ لکھا ہے جیسا کہ
امیر خسرو وغیرہ ان کی تصانیف سے بھی ہم کچھ شہادت یہاں
بہم پہنچاتے ہیں کہ اول اول پنجابی[1] اور اردو ایک ہی زبان
تھی مثلاً خسرو خالق باری میں یہ اردو الفاظ استعمال کرتا ہے
کت (کہاں) پنجابی میں کتھے لکھتے ہیں۔ خسرو کدھی لکھتا ہے۔
پنجابی میں کدی ہے۔ اسی طرح ناؤں۔ چھاڈو۔ سواد۔ چوچی
(پستان) ڈیٹھا۔ ڈٹھا۔ تاپ۔ کوکڑی (مرغی) لیکھنا۔ اکھنا۔
سوہا (سرخ) داکھ (انگور) جل ککڑ (مرغابی) بالا (لڑکا اور بمعنی
جلایا) انت (آخر) یہ سب اردو الفاظ ابتک اسی طرح پنجابی زبان میں بھی
بولے جاتے ہیں۔ ایک قدیم دکنی شاعر قطب شاہ کے کلام میں
بھی پنجابی الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ اسکی حقیقت صفحہ ۸۸ و ۸۹ میں
ملاحظہ کریں۔ غرض پنجابی اور اردو زبان کی ابتدا ایک ہی ہے۔ مگر
ولی کے بعد اسکی نظم و نثر کا جسطرح دلی اور دکن میں رواج ہوا۔ اسکی
داستان تذکرہ آب حیات میں ملاحظہ فرمائیں +

[1] لنگویسٹک سروے آف انڈیا (مولفہ گورنمنٹ) کے سلسلہ میں اک ضخیم جلد موجودہ
پنجابی زبان) کے متعلق ہے وہ بھی ملاحظہ ہو

اُردو ریختہ اور اسکی اصلیت

اُردو زبان از روئے تاریخ پنجابی الاصل ہے ۔ اسکی ایک اجمالی کیفیت اوپر درج ہو چکی ہے ۔ اب ہم لغوی طور پر اُردو ریختہ کی حقیقت اور زبان پنجابی سے اس کی مشابہت واضح کرتے ہیں ۔

اگرچہ لفظ ریختہ کے فارسی میں کئی[1] معنی ہیں ۔ مگر زبان کے تعلق سے فطرتاً اس سے ٹوٹا پھوٹا یا شکستہ ہی مراد لی جاسکتی ہے کیونکہ ایک غیر قوم یا ملک کی زبان ہم جب استعمال کرتے ہیں تو اسکو صاف طور سے بول[3] نہیں سکتے ۔ اس لئے بیسیوں لفظ ہمارے لب و لہجہ میں اصل سے گر جاتے ہیں ۔ اردو کا بھی یہی حال ہے کہ بعض الفاظ تو جیسے فاتح مسلمانوں نے اپنی بول چال میں برتے ویسے ہی یہاں کے لوگوں نے استعمال کئے مثلاً پوشاک[2] میں بغل ۔ کرتہ لبادہ ۔ چوغا ۔ آستین ۔ گریبان ۔ پائجامہ ۔ ازار ۔ رومال ۔ شال ۔ تکیہ ۔ برقع پوستین وغیرہ ۔ خوراک میں دستر خوان چپاتی ۔ پلاؤ ۔ زردہ ۔ فیرنی شیرمال

[1] آب حیات صفحہ ۱۹ میں ریختہ کے بعض اور معنی بھی بیان کر گئے ہیں [2] آب حیات صفحہ ۲۶-۲۷

حریرہ - اچار - فالودہ - گلاب - بیدمشک وغیرہ وغیرہ (یہ تمام اردو الفاظ جو آبحیات
میں درج ہیں زبان پنجابی میں اسی طرح مستعمل ہیں) لیکن کچھ الفاظ توڑ پھوڑ کر
یا ریختہ کر کے بولنے پڑے - مثلاً فارسی عربی میں خیر وصلاح تھا - پنجابی میں
خیر سلا بولنے لگے اور قدیم اردو میں یہی رائج ہوگیا - فارسی آردآبہ تھا یہاں
ارداوہ بنگیا - شوربہ کا شوربا ہوگیا - کیسہ کا کھیسہ بنا - کاہ گل سے کہگل - ہاون دستہ
سے ہمام دستہ - تسبیح سے تسبی - بیگانہ سے بگانہ یا لغانہ اور افراط و تفریط سے افراتفری
وغیرہ - اسی طرح مسلمانوں کو پنجابی پراکرت سے واسطہ پڑا تو انہوں نے بعض
الفاظ تو جوں کے توں رہنے دیئے مثلاً پنڈت - شودر - درشن - مکھ -
سریجن - بچن وغیرہ - لیکن زبان سنسکرت کے اکثر الفاظ انکو ریختہ کر کے
بولنے پڑے جیسے گانڈا سے گنڈیری (پنجاب میں گنڈھ بھی کہتے ہیں
گنا اسی سے ماخوذ ہے - سنسکرت میں بھراتر بھائی کو کہتے ہیں - اسی سے
فارسی برادر نکلا تھا - پنجابی میں برادر اور بھراتر سے بھرا بھی (بہ معنی بھائی)
مستعمل ہے بلکہ اہل زبان بھائی - بھیا بولتے ہیں - پنجابی میں ان سے
زاید بھایا بڑے بھائی کو پکارتے ہیں - سنسکرت میں بیٹے کو پتر کہتے
ہیں - پنجابی میں اسی طرح رائج ہے لیکن دہتر کا دہی بنالیا گیا جو فارسی میں

دختر ہے + اہل پنجاب بولتے ہیں دھی۔ پوت۔ جنوائی۔ قدیم اردو میں اسیطرح رائج تھا۔ چنانچہ نظیر اکبر آبادی کہتا ہے ؎

دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آویگی

سنسکرت بھار۔ پنجابی میں بہار۔ اور پہار دونوں طرح بولا گیا۔ بعد کو اہل دہلی نے اصلاح کر کے اسے بار بنالیا۔ سنسکرت میں بھوم ہے اردو اور پنجابی میں بھی جنم بھوم کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ہت تھا۔ پنجابی میں ہتھ ہاتھ بنالیا گیا۔ اور ہستی کا ہاتھی ہو گیا۔ اور چندر کا چاند۔ چاندنی غرض یہ تمام تغیر و تبدل اور اردو فارسی عربی اور سنسکرت الفاظ میں تصرفات سب سے پہلے پنجاب ہی میں ہوئے۔ اور پھر یہیں سے ہندوستان میں منتقل ہوئے۔ چنانچہ آزاد خود دبی زبان سے صاف اقرار کرتا ہے کہ جو وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا۔ اسی وقت سے ان کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا۔ چند کوی کا کلام ملگیا اس میں تمثیلی الفاظ موجود ہیں۔ محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی ضرور ہونگے اس عبارت سے صریحاً منتج ہے کہ آزاد آبحیات صفحہ ۱۹ میں یہ تسلیم کرتا ہی کہ ریختہ کا آغاز محمود غزنوی کے

عہد ہی میں ہوا۔ جبکہ مسلمانوں کی مستقل حکومت پنجاب سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ بلکہ پنجاب میں بھی جانشینانِ محمود کی سلطنت عموماً صوبہ جات لاہور و پشاور تک ہی محدود رہی تھی۔

غوریوں کے بعد ترکوں۔ لودھی پٹھانوں اور مغلوں وغیرہ نے حکومت کی۔ ان تمام سلطنتوں کے دوران میں پنجاب کو وہی اہمیت برابر حاصل رہی۔ جو انگریزوں کے عہد میں شمالی ہندوستان کو ہے۔ اور فاتح و مفتوح کی زبان ایک دوسرے سے ہمیشہ متاثر ہوتی رہی۔ چنانچہ خلجی ترکوں کے زمانے میں خسرو نے جسطرح ہندی زبان کے الفاظ اپنے ریختہ میں استعمال کئے ہیں انکی مثالیں اوپر خالق باری سے منتخب ہو کر درج کی جا چکی ہیں۔ اور ان کے متعلق واضح ہو چکا ہے کہ وہ بالعموم پنجابی ہیں۔ اب بھگت کبیر جو سکندر لودھی کے عہد کا ہندو شاعر ہے اسکی زبان سے یہ دوہرے منسوب

دین گنوایا دنی سنگ دنی نہ چلیو ساتھ
پیر کہاڑی ماریو پھل نہ آئیو ہاتھ
کبیر سریہ سراے ہے کیوں سوو سکھ چین
کوچ نگارا سانس کا باجت ہی دن رین

آزاد نے بھگت کبیر کے یہ دوہرے اس کے متوطن بنارس ہونے کی وجہ سے بغیر چون و چرا قبول کئے۔ حالانکہ ہندی کے ساتھ کچھ فارسی عربی الفاظ گورونانک کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ اور ان سے قدیم ریختہ اردو کا اسی طرح سراغ چلتا ہی مگر آخر الذکر کلام کو ٹکسال باہر خیال کیا۔ خیر بھگت کبیر کا پہلا دوہرا تو اکثر پنجابی جہلا تک (خصوصاً ضعیف العمر لوگ) آپس میں کہتے سنتے ہیں۔ اور دوسرے دوہرے کے یہ الفاظ یعنی سربر سکھ چین۔ کوچ نگارا باجت ہے وغیرہ پنجابی روزمرہ میں شامل ہیں گویا یہ بھی ایک پنجابی پراکرت تھی جس میں دنیا اور سرائے وغیرہ فارسی الفاظ داخل ہوگئے۔ بلکہ پیر کہاڑ، یا کہاڑی ماری خالص پنجابی زبان ہے۔

بابا تلسی داس فرماتے ہیں ~ گھر تو تردین دباگ برڈرا دیو لگائے۔*

یا ~ کتنی بھنگ گنگہ بھی کھولے + اور گنی گریب نواج وغیرہ

(بحوالہ آب حیات ص۱۷) یہاں باگ (باغ) اور باقی اور فارسی الفاظ بھی جنپر خط کھینچا گیا ہے۔ صاف پنجابی ہیں اور نہ صرف بابا تلسی داس کے زمانے میں بلکہ اسوقت بھی زبان پنجابی میں اسی طرح مستعمل ہیں

* بحوالہ آبحیات

بادشاہ ہمایوں نے قلعہ جہانپانیر[1] فتح کیا تو سلطان بہادر قید ہوا اور اس کا طوطا بادشاہ کے ہاتھ آیا۔ جسکی نسبت آزاد کو پورا یقین ہے کہ وہ طوطا انسان کی طرح بات سنکر جواب دیتا تھا۔ مگر یہ امر طوطے کی فطرت ہی کے خلاف ہے چنانچہ کہا گیا ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استاد ازل گفت ہماں مے گویم

خیر آزاد کو طوطے کی قوتِ گویائی پر بہ نسبت پنجابیوں کی قوت گویائی کے زیادہ اعتبار ہے آپ لکھتے ہیں کہ اس طوطے نے رومی خاں میر آتش کو دیکھا تو فوراً بول اُٹھا۔ پھٹ پاپی رومی خاں نمکحرام۔ اب اس جملے میں آزاد کی نظر صرف نمکحرام کے لفظ ہی پر پڑی اور اس کو یہ ثابت کر دکھانا مد نظر ہے کہ اسوقت لوگوں کی زبانوں پر عربی فارسی الفاظ بکثرت چڑھے ہوئے تھے۔ جسکا اثر طوطے کی زبان پر بھی پہنچا۔ مگر اس فقرے میں پھٹ پاپی کا وہ لفظ ہے جو خالص پنجابی ہے اور ابتک اسی طرح عوام پنجاب میں مستعمل ہو رہا ہے اور

[1] آب حیات صـ ۱۷

نمک حرام جیسے اہل دہلی کی زبان اور لب و لہجہ سے مخصوص ہو ولیسا ہی اہل پنجاب سے ۔ غرض قدیم اردو اور پنجابی میں کچھ فرق نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح بھائی سوداس کے کلام میں ملاحظہ ہو آبجیات ص۱۹ ساز کا ساج ۔ باز کا باج اور جہاز کا جہاج جسطرح استعمال ہوئی ہیں وہ خالص پنجابی انداز ہے ۔ حاصل کلام ۔ قدیم ترین اردو زبان کا سراغ جہاں سے نکالا گیا ہے اسکا سرچشمہ پنجابی پراکرت اور اس میں عربی ۔ فارسی کی شرکت ہی معلوم ہوتی ہے ۔ اب ہم قواعد زبان پر غور کرتے ہیں ۔ مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو کے قواعد اردو صفحہ ۱ میں تحریر ہے کہ اردو کی سب سے پہلی قواعد کی کتاب جان شواکٹلر صاحب کے قلم سے مرتب ہوئی تھی ۔ اس کا مشن انداز ا" ۱۰ ر دسمبر ۱۷۱۱ء کو لاہور پہنچا تھا ۔ اور وہ دلی اور اگرہ سے بھی گزرا تھا ۔ صاحب موصوف اس وقت کی زبان اپنے کانوں سنکر جن قواعد کو ترتیب دیتے ہیں ۔ اس میں فاعل کی علامت "نے" کا کچھ ذکر نہیں کرتے اسی طرح وہ ہم کی طرح آپ کو بھی جمع متکلم ۔

لے اس قواعد پر کچھ اعتراضات بھی شائع کی گئی ہیں مگر ہمیں یہاں ان سے کچھ سروکار نہیں ہے۔

کی ضمیر بتاتے ہیں۔ ایسا ہونا تو . . . . ناگزیر تھا۔ کیونکہ اردو ئے قدیم پنجابی سے ماخوذ ہے۔ اور زبان پنجابی میں علامت فاعل یعنی "نے" حذف کیجاتی ہے مثلاً کہتے ہیں توں کیتا (یعنی تونے کیا) اور اوس لکھیا (اسنے لکھا) وغیرہ اور آپاں جائینگے۔ جس میں آپاں جمع متکلم کی ضمیر ہے۔ جہلائے پنجاب میں ابتک مستعمل ہے۔ غالباً اسی سے آپ جائینگے۔ بہ معنی ہم جائینگے۔ اردو میں وضع کیا گیا۔

در اصل یہ سات آٹھ زبانیں جو تمام ہندوستان میں رائج ہیں۔ سنسکرت سے نکلی ہیں۔ برج بھاشا۔ پنجابی۔ سندھی۔ گجراتی۔ مرہٹی اڑیا۔ ہندی اور بنگالی۔ مگر ان سب میں اردو وریختہ کی اصلیت پر پنجابی کو قریب قریب وہی حق پہنچتا ہے جو ہندی اور بھاشا کو حاصل ہے۔ محققین ادب لکھتے ہیں سنسکرت میں جو لفظ توَم تھا اسی سے تُو نکلا ہے۔ مگر اول اول زبان پنجاب ہی کی طرح یہ لفظ تُوں بولا جاتا تھا۔ بعد کو اصلاح کرکے تُو بنایا گیا۔ کچھ سنسکرت میں کشچت تھا۔ اس سے کچھک اور پنجابی کجھ اور پھر ریختہ میں کچھ بنگیا۔ یہ کا لفظ سنسکرت کے اشہ سے وضع ہوا ہے مگر زبان پنجابی کے توسط سے اور وہ

اسطرح کہ اشہ سے ایہہ بنا - اور پھر ایہ - یہو - یاہ - یعنی آخر یہ بنکر رہ گیا -

اُردو نظم ریختہ میں زبان پنجابی کا عنصر

ہم ولی کے کلام میں پنجابی الفاظ کی کثرت کے متعلق پہلے اشارہ کر چکے ہیں - اور اب بھی تحریر کرتے ہیں ؎

کیتا ہوں تیرے نام کو میں ورد زباں کا ؛ کیتا ہوں ترے شکر کو عنوان بیاں کا

یہ ولی کا مطلع دیوان ہے اہل زبان کیتا ہوں کو عموماً کرتا ہوں لکھدیا کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے - یہاں کیتا ہوں پنجابی ہے - مصرعہ ولی کا ؎

نظر آیا مجھے اک شاہ جواں اسوار تازی کا

اہل پنجاب ایک طاقتور نوعمر آدمی کو شوہ جوان (شاہ جوان) ہی کہتے ہیں اور اسوار کا لفظ تو صاف پنجابی ہے - ولی ؎

جب سے دیکھا پیچ تیری لٹ پٹی دستار کا ،

یہ محاورہ لٹ پٹی دستار عوام پنجاب تک میں بولا جاتا ہے -

؎ لیا ہے جب سے موہن نے طریقہ خود نمائی کا

یہاں موہن سے مراد پیارا یا معشوق ہے جہلائے پنجاب آپس میں

بولتے ہیں "موہنیو۔ سوہنیو"۔

مولوی کریم الدین نے ولی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ قواعد اردو زبان سے نابلد

تھا۔ ایسا ہونا تو لازمی تھا کیونکہ اردو نے قدیم پنجابی سے جنم لیا ہے اور

زبان پنجابی کے قواعد انگریزوں کے آنے سے پہلے شاید کسی نے مرتب

ہی نہیں کیے تھے۔ ولی کہتا ہے ؎

دل میں جب عشق نے تاثیر کیا، حرف باطل خط تدبیر کیا

یہاں دل میں جب عشق نے اثر کیا یا تاثیر کی ہونا چاہیئے۔ لیکن ولی

اپنے ماخذ زبان سے معذور تھا۔ ولہٖ ؎

کیوں نہ صافی اسکو حاصل ہووے مثل آئینہ

اس جگہ صافی صفا کے معنی میں مستعمل ہوا ہے پنجابی میں صوفی صافی

کہتے ہیں یعنی صاف باطن ولہٗ ؎

اے شکر لب قند سے تجھ لب کی ہیں باتاں لذیذ

یہ باتاں خالص پنجابی ہے ولی ؎ چھپا ہوں جوں صدا ہی بانسلی میں

بانسری کو بانسلی کہنا۔ یہ خاص پنجابی انداز ہے ولہٗ ؎

سہ اس نازنیں کی دیکھی ہے جیسے کہ چھب غضب - پنجابی مستورات جب
کسی عورت کو نیا لباس پہناتی ہیں تو کہتی ہیں - اسکی چھب بہت سوہنی (خوبصورت)
ہے - اسی محاورے کو ولی نے باندھا ہے اور قریباً اسی خیال کے ساتھ -
ولی نے ایک شعر میں نزدیک[ل] کو نزیک باندھا ہے اور یہ لفظ زبان پنجابی میں
اسی طرح مستعمل ہوتا ہے - سطور آئندہ میں ولی کے علاوہ اور ریختہ گو
شعرا کے کلام سے بھی ہم اسی مضمون کی تشریح کرینگے - اہل زبان خوب
یقین رکھیں کہ ہم کو انکی یا مصنف آبحیات کی مخالفت ہرگز منظور نہیں
ہے بلکہ اردو ریختہ کی تحقیقات ہمیں صحیح طور پر جس نتیجے کیطرف لیجارہی ہی
فقط اسکی تکمیل اور اسکو تابہ اختتام پہنچانا مدنظر ہے نہ کہ کسیکی دلآزاری
شاہ آبرو سہ جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہئے ٭ اہل پنجاب
عموماً زیادتی ہی بولتے ہیں جو اب فصیح اردو میں متروک ہی - میرزا گرامی دہلوی ہے
سہ حاضری بن محل نہیں کھاتا ٭ بیگمی ہے پنیر منعم کا ٭ پنجاب میں
چاولوں کی ایک قسم بیگمی کہلاتی ہے - غالباً اردو مین بیگمی اب اسطرح بولا نہیں
جاتا - مضمون سہ مضموں توں شکر کر کہ ترا اسم سن رقیب ٭ یہاں توں
خالص پنجابی ہے جیسے کہ اوپر لکھا گیا ہے - یکرنگ سہ

لہ اہل دانش نہ جائیں اس کے نزیک (بحوالہ مثنوی سورت)

خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن ❊ جب سے تیرا وہ دوستدار ہوا

دوستدار یا دوستداری پنجابی میں تاحال مستعمل ہے مگر اُردو میں دوست اور

دوستی ہی فصیح خیال کئے جاتے ہیں۔ ولہ ؎

سچ کہے جو کوئی مارا جائے ❊ راستی ہیگی دار کی صورت

پنجابی میں ہیگا یا ہیگی اب تک برابر بولتے ہیں۔ یہاں سے یہ لفظ دلی دکن

اور پھر لکھنو پہنچا تو وہاں بول چال میں کہیں کہیں سنا گیا ہے طرز تحریر میں

اب متروک ہے۔ ناجی ؎ موجی ہے اپنے من کا کچھی نہ دے کہے سے

اہل پنجاب "من کی موج" یہ فقرہ اکثر بولتے ہیں ولہ ؎

اغنیا کے در اور پرمقدور ہو جبتک نہ جا ❊ سخت حاجت ہو تو پھر لاچارگی ہے جا ضرور

یہ شعر صنعت ایہام میں ہے۔ اہل پنجاب پاخانہ یا پائخانہ کو اکثر جا ضرور ہی کہتے ہیں

یہاں آ اوپر کا استعمال لہجہ پنجابی کے قریب قریب ہے حکیم شاہ جہان آبادی ؎

دنیا نہ کر جوانوں سے یہ بوڑھا چوچلا ❊ اسجگہ چوچلا یا نخرہ خالص پنجابی لفظ ہے

؎ تیرے ہی قدم تلے گئی رُل جھنڈی۔ رُلنا یعنی ذلیل ہونا زبان پنجابی سے

مخصوص ہے میر درد ؎ جیدھر پھرے وہ ابرو اودھر نماز کرنا ❊ پنجابی میں جدھر

اور اودھر اب تک مستعمل ہیں۔ میر سجاد دہلوی ؎ یہ دھواں سا فلک ستاروں سا تھا

یہاں کے کا حذف پنجابی روزمرہ کے عین مطابق ہے جو کہتے ہیں وہ اپنے
بھائیاں ساتھ گیا ہے۔ حاتم ؎ ان دنوں میں دیکھکر ہمکو ابھرتے ہیں رقیب
پنجابی کا محاورہ ہے وہ آجکل غرور سے ابھریا پھرتا ہے۔ یعنی ابھرتا ہے۔
احسن ؎ سراپے کو ہم لے گئے جیوں اسکے قدم تک ٭ بیان ؎
لینا اگر ہے دل کو تو لے بھی اسی کہیں ٭ سینہ میں اب تلک تو رکھا مار کوٹ[1] کر
ولہ ؎ کیا ایسے سے درد دل کو کہئے ٭ ایدھر تو سنا اودھر فراموش
تاباں ؎ فغاں نے میرا آکے منہ کھلایا ۔ حاتم ؎
زور چترا ہی ہے یہ دل کا کبوتر حاتم ٭ سرت کر لیتا ہے جب اڑتا ہی اسکی کو کا
حسرت عظیم آبادی ؎ ترے کوچے سے باز نہیں آتا ۔ یہ دل خانماں خراب مرا
ولہ ؎ چراغ دل پھیر تازگی پہ پہونچی ۔ دردمند ؎ تجھے وعدہ کر بھول جانیکی سوں
ولہ ؎ تجھے جیونا میرا بھاتا نہیں ۔ نواب محبت خاں ؎ وہی گویا صراحی دار گردن
ہدایت ؎ ہدایت بھی تو کوئی زور ہی شہد اشکستہ ہے ۔ ان تمام الفاظ کو جو اس
جگہ زیر خط ہیں ۔ قدیم اردو ریختہ تسلیم کیا گیا ہے ۔ مگر حقیقت میں یہ سب پنجابی
الفاظ ہیں تذکرہ گلشن ہند صـ ۸۳ میں حاتم کا ایک شعر درج ہوا ہے ؎
تو نہ ووڑ تک اٹھا نقاب کے تئیں ٭ میں سمجھا تونگا اضطراب کے تئیں

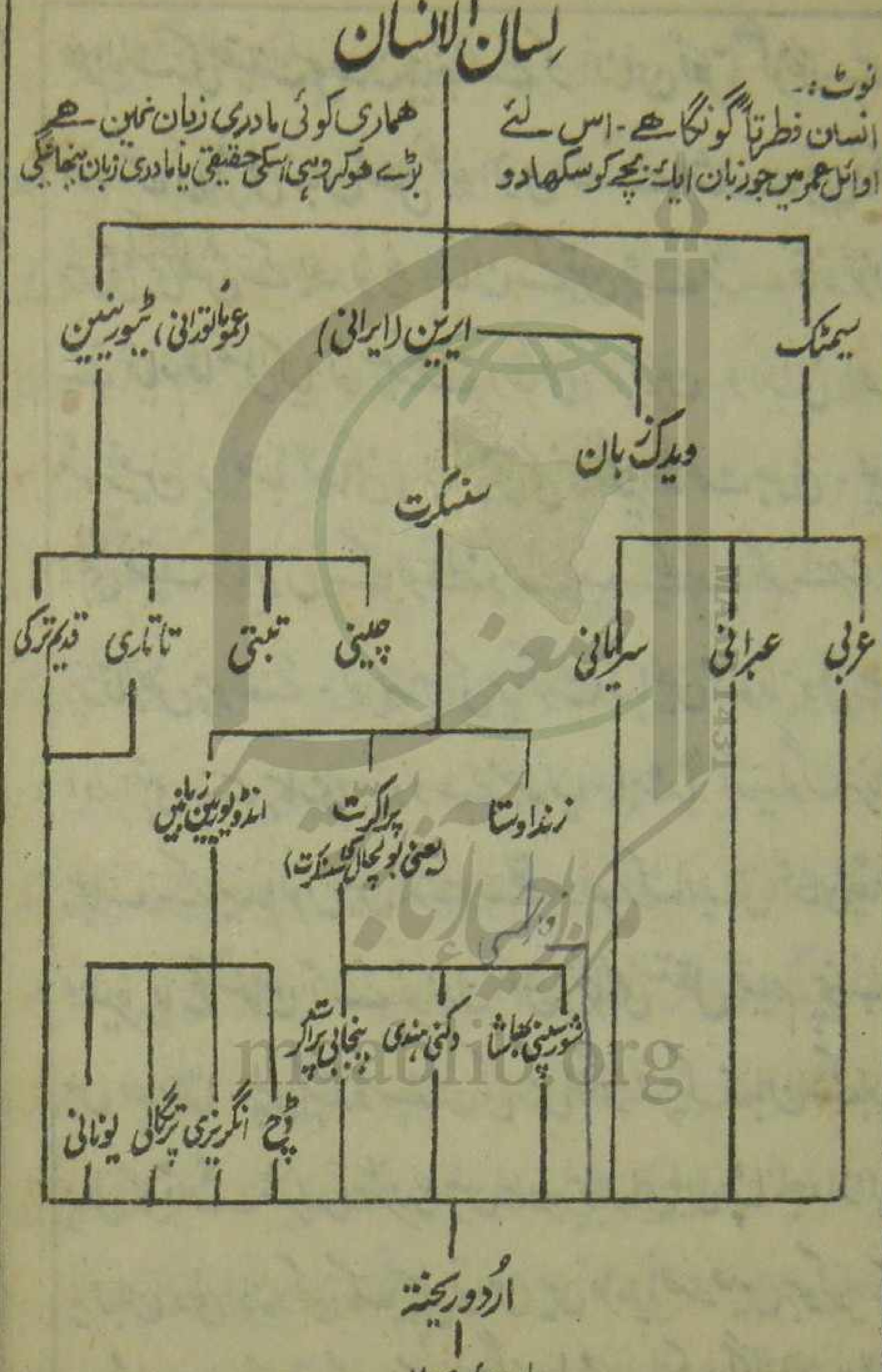
[1] مار کوٹ یا مار کٹائی بھی کہتے ہیں ۔ (یہ پنجابی محاورات ہیں)

اسپر مولینا شبلی مرحوم حاشیے میں فرماتے ہیں کہ یہاں سمبھالونگا تقطیع سے گرتا ہے
سنبھالونگا ہونا چاہیے۔ مگر یہ معلوم سنبھالونگا اسوقت مستعمل بھی ہوتا تھا یا کہ نہیں
ہاں پنجابی میں سمھالونگا بغیرب کے کہتے ہیں اور یہ جسطرح تلفظ میں آتا ہے
وہی اس جگہ ٹھیک اترتا ہے غالباً یہی لفظ شاعر نے لکھا ہوگا۔ اس مضمون
کو اب زیادہ طوالت دینا تحصیل حاصل ہے۔ اردو زبان بیشک پنجابی الاصل ہے۔

زبانِ اُردو کی روز افزوں ترقی اور اسکی عالمگیر تعلقات

بین بائیس کروڑ ہندوستانی اردو سمجھ سکتے اکثر انہیں سے اس زبان میں بات چیت کرتے اور لکھتے پڑھتے
ہیں۔ یورپ۔ ایشیا۔ افریقہ اور امریکہ جیسے دور دراز ملکوں میں جہاں کہیں اہل ہند کو
ملازمت یا تجارت کیواسطے سے جانا پڑا ہے۔ اُردو وہاں پہنچ گئی ہے بلکہ انڈین سول سروس
کا ایک کورس بنکر یہ زبان خاص اہل یورپ کے منہ ایسی لگی ہے کہ وہ بھی اسکو
تمام اقطاع عالم میں اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں گویا اردو علم ادب روز
بروز وسعت حاصل کر رہا ہے۔ ویسے بھی اسکے سرمایہ لغات میں ترکی یونانی
عربی۔ عبرانی۔ سریانی۔ فارسی۔ انگریزی۔ سنسکرت یعنی تمام دنیا کی کلاسیکل
(قدیم و مستقل) زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور آئے دن شامل ہوتے
رہتے ہیں۔ بلکہ عربی فارسی کیطرح اب انگریزی الفاظ بھی مل جُل گئے ہیں۔

علم الالسنہ کی حقیقت سے صاف پایا جاتا ہے کہ انسان فطرتاً گونگا ہے۔
اور اس کی اصلی زبان محض حیوانوں کے سے اشارے ہیں لاکھوں
برس کی باہمی کشمکش کے بعد نوع انسان کے تین بڑے بڑے خاندانوں
نے قیام حاصل کیا تو سیمٹک (سامی) ایرین (ایرانی اور
ٹیورنین (اغلباً تورانی) زبانوں کی عالمگیر اشاعت ہوئی - پھر
انہی مختلف زبانوں کے بولنے والے جب یکے بعد دیگرے ہندوستان
پر قابض ہوئے - تو یہاں کی پراکرت زبانیں مخلوط ہوتی رہیں
اور انہی سے ہماری اردو نے جنم لیا - ابتداً آریہ لوگ سرزمین
پنجاب کے میدانوں میں اترے تھے - پھر ترک ایرانی افغان پٹھان
وغیرہ فاتح مسلمان آئے تو اول اول انکا بھی مستقل قیام پنجاب ہی
میں ہوا تھا - پس ہندوستان کی اس لنگوا فرینکا زبان کے بول
چال کا ڈھنگ شروع شروع میں صوبہ پنجاب ہی میں پڑا بعدازاں
یہ زبان دلی اور دکن تک پہنچی تو اس میں مزید اصلاحیں ہو کر یہ ریختہ
سے اردو؛ اور پھر اردو سے اردوئے معلیٰ بنگئی اب اردو اور اسکے عالمگیر تعلقات تمام
دنیا کی زبانوں کے ساتھ نقشہ ذیل میں واضح کئے جاتے ہیں -



انتباہ: صفحات آئندہ میں ہم موجودہ اردو نظم شعر و شاعری کے تعلقات اور شعرائے قدیم و جدید کے حالات کیطرف متوجہ ہونگے ۔

۷۸۶

الجزو الاوّل

(شعر و شاعر)

شعر کی تعریف

یوں تو شعر کی متعدد و مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ مگر ایک یہ ہے کہ جن حقائق کو ہمارے خیالات و محسوسات نے دریافت کیا ہو۔ جب ان کا اظہار ایک قید وزن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تو اسی کو شعر کہا جاتا ہے۔ مثلاً یہ دو باتیں ہم سب جانتے ہیں کہ جو کچھ خواب میں نظر آتا ہے وہ بیدار ہو کر دکھائی نہیں دیتا اور جن باتوں سے جوانی میں واسطہ پڑتا ہے۔ وہ بڑھاپے میں اکثر موجود نہیں رہتی۔ پس انہی دو کیفیات

سے مختلف مواقع پر متاثر ہو کر شاعر کہتا ہے ؎

وقتِ پیری شباب کی باتیں ٭ ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

دیکھو اس شعر میں ایک قسم کی روانی یعنی وزن شعر بھی پایا جاتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو شعر شعر ہی نہ رہے بلکہ نثر ہو جائے۔

یہ شعر شاعر کے محسوسات کا نتیجہ ہے۔ اب ایک اور مثال لو۔ ایک شاعر کسی جانور کو پنجرے میں بند دیکھتا ہے۔ اس کی قید کے متعلق طرح طرح کے خیالات اپنے دل میں دوڑاتا ہے اور یہ بھی سوچتا ہے کہ گو یہ جانور مقید ہے۔ مگر اس وقت کوئی شخص اس کے شکار کرنے کی فکر میں نہیں ہے لہذا یہ جانور اب بالکل اطمینان کی حالت میں ہے۔ مگر وہ شاعر اپنے ان خیالات کو بعینہ اسی طرح نظم نہیں کر دیتا بلکہ ان کو اس محبوس جانور کی زبانی یوں قلمبند کرتا ہے ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ شعر شاعر کی محض خیال آرائی یا نازک خیالی کی ایک مثال

ہے۔ لہذا شعر گوئی میں کسی جگہ محسوسات سے اور کہیں خیالات کے گھوڑے دوڑانے سے ہمیشہ سروکار رکھنا پڑتا ہے۔ مگر ایک اچھا شعر عموماً وہی ہوا کرتا ہے کہ جس میں محسوسات اور خیالات دونوں کا اشتراک پایا جائے۔ مثلاً ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یا ؎

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ پھر ملینگے اگر خدا لایا

یا ؎ نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے

دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

ان شعروں میں خیالات و محسوسات دونوں کو ملا جلا کر برتا گیا ہے۔ اسی لئے یہ تینوں شعر بیمثل ہیں۔

لیکن اگر کسی شعر میں صرف خیال ہی خیال ہو۔ تو وہ شعر ناقص رہتا ہے۔ مثلاً غالبؔ ؎

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا صحرا کا کہ صحرا جل گیا

یہ نرا خیال ہی ہے۔ ورنہ کسی کے محض اعادۂ صحرا کرنے
سے صحرا کب جل سکتا ہے۔

اسی طرح ایک شعر امیر مینائی کا ہے ؎

کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخ گل سے کوئی پھول
آتش گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں،

یعنی صرف لال لال گلاب کے پھول کے پکڑنے سے کسی کا ہاتھ کبھی نہیں جل سکتا۔ خواہ وہ شخص کیسا ہی نازک مزاج کیوں نہ ہو

امیجنیشن اور اس کا شعر پر اثر

زبان انگریزی میں خیال کو امیجنیشن کہتے ہیں۔ اس کے متعلق مولانا حالی نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں بڑی بڑی بحثیں پیش کی ہیں کہ خیال کس کس طرح شعر پر اثر کرتا ہے۔ مگر میری دانست میں خیالات صرف ہمارے محسوسات ہی کی توسیع کا دوسرا نام ہے۔ اور ہماری تمام ذہنی کیفیات کی

بنا حقیقت میں انہی معمولی حواس خمسہ پر ہے یعنی دیکھنا۔ سننا
سونگھنا۔ چھونا۔ اور چکھنا۔ انہی محسوسات سے نہ صرف شاعری
بلکہ جملہ علوم و فنون آجتک مدون ہوئے ہیں۔ اور آئندہ بھی
انہی سے ہر جگہ ہمیشہ کام لیا جائے گا۔ پس جو بات ہمارے
حواس ہی سے خارج ہو۔ مثلاً دیوؤں اور پریوں وغیرہ کا
وجود تو جو شاعری ان باتوں پر قائم کی جائے گی۔ وہ بھی
اصلیت سے بالکل دور ہوگی۔ گویا کسی شعر کی اصلیت کی،
تصدیق ہمارے حواس ہی سے ہونی چاہیئے۔

اب خیالات کیونکر ہمارے حواس خمسہ سے پیدا ہوتے
ہیں۔ ان کی ایک مثال یہ ہے کہ فرض کرو ہم ہر روز ایک
باغ میں جاکر موسم بہار کی سیر کیا کرتے ہیں۔ طرح طرح،
کے پھول چنتے ہیں۔ لذیذ سے لذیذ میوے کھاتے ہیں
مگر وہ بہار کا موسم تھوڑی مدت سے زیادہ نہیں رہتا۔ فوراً
خزاں ہو جاتی ہے۔ پس جب دنیا میں انسان کی خوشی
کے دن بھی اسی طرح دیرپا نہیں ہوتے۔ تو اس سی ہمارے

دل میں یہ بات خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ ہماری زندگی بھی گویا ایک چند روزہ بہار کا سا موسم ہے۔ پس اسی خیال کو ایک شاعر نظم کر دیتا ہے تو کہتا ہے ؎

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہی خزاں کا

شاعری کی حقیقت

مقدمہ شعر و شاعری میں مولینا حالی نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ شعر میں جو خیال کھپایا جائے وہ ہمیشہ سچّا ہونا چاہیے۔ ورنہ شعر شعر نہیں رہتا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے مثلاً حسن و عشق کی شاعری کی تردید میں خود مولینا موصوف ایک جگہ مسدس میں فرماتے ہیں ؎

زمیں اس سے ہے زلزلہ میں برابر
ملک اس سے شرماتے ہیں آسماں پر

حالانکہ نہ زمین فی الواقع اسی بات سے کبھی متزلزل ہوئی ہے

اور نہ فرشتوں کو ہماری شاعری سے شرمانے کی کچھ ضرورت ہے۔

پھر ایک اور موقع پر وہ لکھتے ہیں ؎

مثال ان کی کوشش کی ہے صاف ایسی
کہ کھائی کہیں بندروں نے جو سردی[1]

وغیرہ وغیرہ ۔ ان اشعار میں مولانا نے بندروں کی ایک تمثیل لکھی ہے۔ کہ ان کو جنگل میں سخت سردی محسوس ہوئی تو ایک جگنو کو پکڑ کر آگ سلگانے لگے ۔ لیکن یہ واقعہ ہی سراسر غلط ہے کیونکہ انسان کے سوا اور کسی حیوان کو آگ سُلگانے کا خیال کبھی پیدا نہیں ہُوا۔ ورنہ ایسا ہوتا تو شاید دنیا کی حالت ہی دگرگوں ہو جاتی[2]۔ تاہم اس قسم کے جھُوٹے جھُوٹے خیالات ہی سے جو کہیں کہیں مسدس حالی میں بھی باندھے گئے ہیں۔ ہر قسم کے شعر کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ شاعری اکذبہ احسنہ کی تفسیر ہے اور بقول حالی ہر شاعر کا خواہ وہ کیسا ہی ہو یہی[3] دستور العمل ہونا چاہیے ؎

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے

[1] ملاحظہ ہو مسدس حالی

[2] انسان کی تمام تہذیبی ترقی آگ کے بنانے

یہ ہے بضاعت اپنی اور یہی ہے دفتر اپنا

موضوع شعر گوئی

مولانا حالی نے جس وقت اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ اسوقت اردو شاعری کا معیار کمال صرف غزل گوئی تھا۔ جس کی بنیاد حسن و عشق کے مضامین پر ڈالی گئی تھی۔ مگر اب شعر کا مدّعا اور شعر گوئی کا موضوع وہ نہیں رہا ہے۔ اگرچہ غزلیں بھی کہیں کہیں لکھی جاتی ہیں۔ مگر زیادہ تر اخلاقی اشعار۔ جذبات فطرت۔ قومی ملکی و سیاسی نظمیں اور مناظر فطرت کی قدر کی جاتی ہے۔ پس آجکل یہی موضوع ہماری اُردو شاعری کا قرار دیا جانا چاہیئے۔ بلحاظ موضوع شاعری ان تین تعلقات سے اپنا قدم کبھی باہر نہیں رکھ سکتی۔ **الوہیّت۔ حکومت اور حُسن صورت**

۱۔ الوہیّت

سے مراد ایک ایسی طاقت کی پرستش ہے جس کو انسان اپنے اوپر ہر طرح فائق و برتر سمجھتا ہو۔ مثلاً دیوتا۔ پیمبر۔ خدا وغیرہ

اوتار وغیرہ ۔ یہی چیزیں مذہب کی بنیاد ہیں ۔ اور مذہب ہی سے کسی قوم کی معاشرت اور اخلاقی و قومی خیالات نشوونما حاصل کرتے ہیں ۔ پس جو شاعری اس موضوع پر یعنی الوہیت پر مبنی ہوگی ۔ اس کے لئے شاعر کو دنیا کے مختلف مذاہب کی حقیقت ۔ بزرگان دین کے کیرکٹر ۔ اور علم الاخلاق ۔ علم حدیث آسمانی صحائف اور میٹا فزکس یعنی علم الٰہیات کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا ۔ یہی الوہیت کی شاعری دوسرے الفاظ میں قومی شاعری کہلاتی ہے ۔ دنیا کی تمام مقدس کتابوں وید انجیل زبور بلکہ قرآن کی طرز بھی شاعرانہ ہے اردو میں کسی قدر دبیر و انیس اور زیادہ تر مولینا حالی نے اس موضوع پر شعر کہا ہے ۔ اکبر اور اقبال بھی کچھ اسطرف جھکے ہیں ۔ مگر انہوں نے کوئی خاص رنگ اختیار نہیں کیا ۔

حکومت ۔ شعر و شاعری کو حکومت کے جذبہ اور اس کے تعلقات نے بھی ہمیشہ متاثر رکھا ہے ۔ بلکہ عموماً باکمال شعرا کو یا تو بادشاہ اپنا ملک الشعرا بنا لیتے رہے ہیں ۔ یا اس کی طرف سے غافل کبھی نہیں رہے ہیں ۔ مثلاً حال میں ڈاکٹر محمد اقبال

کو سر کا خطاب حکومت نے عطا کیا ہے۔ اسی طرح اردو زبان کے اکثر قابل شعرا مثلاً میر تقی میر۔ سودا۔ ناسخ۔ آتش۔ انشاء اللہ خان ذوق اور غالب وغیرہ بعض شخصی سلطنتوں کے دست پروردہ رہے ہیں۔ اس سے ان کو آزادانہ سیاسی نظمیں لکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن حال میں شعرا نے بیسیوں سیاسی نظمیں قلمبند کی ہیں۔ جن میں حکومت کی قصیدہ خوانی نہیں بلکہ اس پر کچھ مناسب چوٹیں بھی کی گئی ہیں۔ مثلاً طلوع اسلام میں اقبال نے ایک جگہ یہی مضمون ان اشعار سے شروع کیا ہے ؎

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے[1]

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

پھر اسی سرمایہ داری کے خلاف خضر راہ میں ان الفاظ کے ساتھ اعادہ کیا گیا ہے ؎

---

[1] یہ دونوں نظمیں خضر راہ اور طلوع اسلام حال میں چھپ چکی ہیں وہاں ملاحظہ فرماویں۔

بندۂ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات وغیرہ

غرض ایپک شاعری جس میں کسی کی بہادری اور سلطنت وحکومت کے افسانے کو نظم کیا جاتا ہے (جیسے شاہنامہ سکندر نامہ۔ رامائن اور مہابھارت وغیرہ) وہ بھی شعر کے اسی موضوع سے پیدا ہوتی ہے۔

اس صنف شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے۔ شاعر کو پولیٹیکل سائنس۔ جغرافیہ۔ قومی و ملکی تاریخوں۔ عام اخباری واقعات اور علم سیاست مدن سے کماحقہٗ واقفیت ہونا چاہئے۔

حُسنِ صُورت

شاعری کے معنی اپنے ماحول سے متاثر ہونا ہے۔ چونکہ کسی مرد یا عورت سے جو حسین ہو۔ ہر شخص کے دل پر کچھ چوٹ لگتی ہے۔ اس لئے شعرا نے حسن و عشق کی شاعری میں انتہا سے زیادہ سر کھپایا ہے۔ اور خسرو سے لیکر ڈاکٹر اقبال

تک زبان اردو میں سب شعرا نے غزلیں لکھی ہیں۔ تاہم دنیا میں صرف ایک عورت اور مرد ہی کی خوبصورتی سب کچھ . . . نہیں ہے۔ بلکہ پہاڑ۔ دریا۔ جزیرے۔ سمندر۔ آبشار۔ باغ۔ نہریں۔ پھول۔ پتے وغیرہ وغیرہ مناظرِ فطرت بھی سب، خوبصورت اور مؤثر معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ سردی گرمی۔ اور بہار و خزاں کی مختلف کیفیتیں بھی بڑی دلچسپ ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا حسن و عشق کے بجائے ہمارے شعرا کو آئندہ مناظرِ قدرت و جذباتِ فطرت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور اس قسم کی شاعری کی جزئیات مطالعہ کرنے کی قابلیت بہم پہنچانا چاہیئے اور اس کے لئے کئی طرح کے جدید علوم مثلاً طبعی جغرافیہ۔ سائکولوجی یعنی علم النفس۔ علم آب و ہوا نیچرل ہسٹری (حیوانات کے حالات)، علم نباتات اور خود چل پھر کر بھی قدرتی مناظر کے مشاہدوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

ـــہ محمد الیاس صاحب بی۔ اے برنی نے ایک مجموعہ مناظرِ قدرت

استعدادِ شاعری

شاعری کبھی اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی - یہ بالکل صحیح ہے. کیونکہ جو شخص از روئے فطرت شاعر ہوتا ہے وہی شعر کہہ سکتا ہے۔ مگر پھر بھی بعض اصول و قواعد سے مبتدی شعرا کو حصول فن میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لئے یہاں کچھ قواعد ادو شعرگوئی کے متعلق قلمبند کئے جاتے ہیں۔

جب شعر کہنے کا ارادہ کیا جائے ۔ تو شاعر کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا اس وقت اس کا حافظہ اپنی پوری طاقت سے کام کر سکتا ہے یا کہ نہیں ۔ کیونکہ شاعری زیادہ تر دوسرے شعرا ہی کے شاعرانہ جذبات سے مستفاد ہونا - اور انہی کے نمونوں پر قلم اٹھانا ہے۔ بعض شعرا رات کو شعر کہا کرتے ہیں۔ بعض جس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) اور دوسرا جذبات فطرت کا شائع کیا ہے۔ ان کو غور سے پڑھنا چاہیئے۔

وقت فرصت ہو۔ مگر عموماً علی الصبح حافظہ اور دماغ کی حالت سالم ہوتی ہے۔ لہذا اسی وقت فکر شعر کرنا چاہیئے۔

(۲) شعر کہنے سے پیشتر یہ فیصلہ کر لو کہ تمہاری نظم غزل ہوگی یا قصیدہ۔ مسدس۔ مثنوی۔ رباعی۔ قطعہ۔ مستزاد۔ فرد۔ ترجیع بند یا قطعہ بند۔

(۳) شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے لہذا پہلے دوسرا مصرعہ کہو پھر اسپر پہلے مصرعہ کو پھیلا دو۔ مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے ہاں غزلگو شعرا عموماً اسی طرح کرتے رہے ہیں۔ ؎

(۴) شعر حتی الامکان سادہ کہنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ خصوصاً نیچرل شاعری میں۔ کیونکہ اسکی ابھی ابتدا ہے اور جیسے غزل میں اول اول سادہ شعر ہی لکھے گئے۔ مسلسل اور نیچرل نظمیں بھی عموماً سادہ زبان میں لکھنی چاہئیں۔ مگر سادگی سے مراد خیالات اور الفاظ کی سادگی ہے۔ یعنی جو خیالات نظم کرنا چاہو۔ ان کی تصدیق ہمارے حواس سے بھی بخوبی ہو سکتی ہو۔ اور الفاظ بھی ایسے لائے جائیں۔ کہ ہر شخص ایسی کیفیتوں کو دیکھکر قریباً

؎ چونکہ رباعی کا چوتھا مصرعہ نہایت زوردار ہوتا ہے۔ اسکا مضمون پہلے [illegible]

اسی قسم کے الفاظ میں ان کا اظہار کرنے پر مائل ہو۔

(۵) ہر شعر میں کوئی خاص نتیجہ ایسا بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔ جس سے محبت۔ نفرت۔ خوشی۔ غمی اور کسی کام کی تحریک یا اس سے احتراز کرنیکی طرف میلان پیدا ہو۔ یہی صفت دوسرے لفظوں میں جوش طبعی کہلاتا ہے۔ (۶) مسلسل اور اخلاقی نظموں کے لکھتے وقت پہلے اپنی نظم کی تمام جزیات یعنی کسی واقعہ یا بات کے ابتدائی درمیانی اور آخری سب حالات کاغذ پر لکھ لو۔ پھر انکو اسقدر کم الفاظ میں کہ جن سے ان سب جزیات کا کما حقہ اظہار ہو سکے نظم کر دو۔ اسی سے خود بندش کی چستی بھی پیدا ہو جائیگی۔ (۷) حتی المقدور روزمرہ اور صفائی و سلاست زبان کے اوصاف ہر ایک مصرع میں مدنظر رکھو۔ کیونکہ یہی فصاحت کے خاص ارکان ہیں (۸) کوئی غیر مانوس مشکوک یا مغلق لفظ نہ لاؤ۔ اور قواعد صرف و نحو کی بھی احتیاط رکھو (۹) الفاظ ہمیشہ سبک شیریں صاف و شستہ اور ایسے برتنے چاہئیں کہ ان کو شعر میں پڑھنے سے سلاست بیان و زبان کا حظ۔ اور کانوں کو ایک گونہ لطافت محسوس ہو (۱۰) ایک مقام پر معمولی اردو لفظ بھلا معلوم ہوتا ہے جیسے اوس دوسری جگہ اس کے عوض شبنم پسندیدہ معلوم ہوتا ہے لہذا جو لفظ اقتضائے مقام سے بہتر نظر آئے اسی کو استعمال کرو چنانچہ جبتک کسی شعر کے

کچھ الفاظ کانوں کو کھٹکتے ہوں ہرگز مطمئن نہ ہوجاؤ اور لفظوں کو بدل بدلکر نظم کرو اور دیکھو کہ سب سے بہتر و موزوں لفظ کونسا ہی (۱۱) اگر معمولی اردو الفاظ سے فقرہ یا مصرعہ طول پکڑے تو عربی فارسی یا انگریزی الفاظ استعمال کر کے مصرعہ کو بہت بڑھنے نہ دو کیونکہ ان زبانوں کے اکثر الفاظ واحد ہی بہت سا مطلب ادا کر سکتے ہیں یا کسی وقت انکی اشعار میں استعمال کرنے سے شعر کا وقار بڑھ جاتا ہی (۱۲) سوقیانہ اور ایسے الفاظ جو عموماً جہلا بولا کرتے ہیں بہت کم لکھنے چاہئیں (۱۳) شعر کے ہر ایک لفظ بلکہ ہر ایک لفظ کے اگلے پچھلے حرفوں پر بھی غور کر کے دیکھو۔ کہ انکی آوازیں کانوں کو ناگوار تو معلوم نہیں ہوتی (۱۴) جب ایک نظم مکمل کر لو تو پھر بھی اسکو دیکھو کہ اسکے اشعا اگر آگے پیچھے کئے جائیں تو کیا اس سی اور زیادہ زور کلام پیدا ہو سکتا ہی - اگر ایسا ہو سکتا ہو تو فوراً وہ ترتیب اختیار کرو (۱۵) پہلی ایک شعر کیلئے جتنے قافیے مل سکیں انمیں وہ شعر زبانی زبانی نظم کر کے دیکھو کہ بہتر قافیہ کونسا ہی - یہ احتیاط کر کے جہاں وہ شعر لکھنا ہو وہاں اسی لکھدو (۱۶) علم عروض - بیان - علم معانی و بدیع وغیرہ کی کتب مطالعہ کر کے انکی اصول حفظ کر لینے چاہئیں (۱۷) جن اشعا میں تشبیہات استعارات اور اردو محاورے استعمال ہوئی ہوں انکی کافی تعداد حفظ ہونی چاہیے (۱۸) لیکن سب سے بہتر بات شعرائے حال کے کلام اور انکے حالات زندگی کو نمونہ بنانا ہی صفحات آئندہ میں اسی مضمون کی توضیح کیجائیگی ؛

الجزو الثانی

استفادہ کلام و استفاضہ حالات اکابر شعرا

شعر وشاعری کی تعریف - اسکی اہمیت - اصلیت اور شعر کس طرح کہنا چاہئے؟ ان مضامین کے تعلق سے مولانا آزاد و شبلی و حالی وغیرہ محققین ادب اردو نے بہت کچھ لکھا ہے اور کسی نے ایمجنیشن (قوت خیال) کو شعر کی بنیاد کہی ہے۔ کسی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ خیال کوئی چیز نہیں ہے الفاظ کی عمدگی ہی شعر کو سحر بنا دیتی ہے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ شاعری کے دو جزو ہیں مادہ اور صورت یعنی کیا کہنا چاہیے اور کیونکر کہنا چاہئے۔ لیکن حقیقت میں یہ سب فن شعر کے اصول مفروضہ یا تصویریاں ہیں بلکہ مشکلی یعنی عملیہ شعرگوئی کیلئے صرف سجیشن (Suggestions) کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ ایک انگریزی لغت ہے جسکے معنی سوجھنے یا ایک بات سے دوسری بات کا احساس ہونا ہے۔ (ملاحظہ ہو علم سائیکولوجی) یہ سجیشن کس طرح ہوتا ہے اسکی ایک واضح مثال یہ ہے کہ قدیم اردو شعراء میں یہ عام دستور تھا کہ ایک مصرعہ طرح تجویز کیا جاتا تھا جو سب شعراء میں تقسیم ہوتا تھا۔ اسمیں ردیف و قوافی کی قید لگا دی جاتی تھی جسکے سب شاعر پابند ہوتے تھے اور انہی ردیف و قوافی میں جو جو خیال کسی کو سوجھتا تھا یعنی سجسٹ ہوتا تھا وہ اسی کو نظم کر دیتا تھا۔ اب ہماری نیچرل یا جدید شاعری بھی اسی قدیم شاعری سے مستفاد اور اسپر مبنی ہے۔ مگر قدما کیلئے حسن و عشق کا ایک ایسا واحد و جامع مضمون تھا کہ ان کو اپنی شعرگوئی و سخنوری کیلئے اور کسی مضمون کے تلاش کرنے کی کچھ ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ حالانکہ ہمارے ہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اب شعر و شاعری میں سب سے زیادہ دقت طلب امر انتخاب مضمون ہے۔ **نیچرل شاعری** کے تعلق سے اس عقدہ کو اول اول مولوی محمد حسین آزاد نے سلجھایا مگر وہ نئی یا پرانی کسی شاعری میں بھی کامیاب نہ ہو سکے (ہاں نثر میں انکا نظیر نہیں ہے) حالی نے واقعات و حالات موجودہ سے استفادہ و استفاضہ کر کے ملکی و قومی شاعری - اکبر نے مجلسی اور شبلی نے اسلامی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ حضرت شہباز نے بچپانہ

لٹریچر کو وضع کیا۔ مگر شعر و شاعری کا دائرہ ایسا تنگ نہیں ہے۔ اکبرؔ۔ حالیؔ۔ شبلیؔ
شہباز کے قدم بقدم باقی شعرا بھی کس کس طرح اپنے لئے کوئی خاص میدان عمل پیدا
کر سکتے اور اسمیں بخوبی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ان امور کو اوراق آیندہ میں واضح کیا جائیگا۔

اکبر الہ آبادی

مولانا آزاد نے آب حیات میں اردو زبان کی اصلیت کے متعلق لکھا تھا۔
محمد شاہی دور تھا۔ اور عیش و عشرت کی بہار تھی ہمارے شرفانے وہی فارسی
کے خاکے اردو میں اتار کر غزل خوانیاں شروع کردیں لہذا اول جو کچھ نصیب
ہوا شعرائے اردو کی بدولت ہوا۔ یہی سبب ہے کہ یہ زبان مفلس رہی اگر
اس عہد میں علوم و فنون۔ تاریخ۔ فلسفہ۔ ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا۔ تو
اس کے لئے بھی الفاظ ہو جاتے وغیرہ وغیرہ۔ (ملاحظہ ہو آبحیات)
لیکن یہ بات درست نہیں ہے، کیونکہ اس وقت فارسی ملکی اور درباری زبان
تھی۔ اور اس ہی میں تاریخ فلسفہ اور مختلف علوم کی کتابیں تمامتر موجود تھیں
مگر اردو زبان کی ابتدا تھی۔ اگر اس ہی میں نثر لکھی جاتی اور اس نثر میں جملہ فارسی
علوم و فلسفہ و تاریخ وغیرہ کھپانے کی کوشش بھی کی جاتی تو رائیگاں جاتی۔
کیونکہ اردو میں ذخیرہ الفاظ بلحاظ علمی اصطلاحات و لغات اس قدر کم تھا کہ
یہ مطلب کبھی پورا ہی نہ ہو سکتا تھا تاہم برٹش گورنمنٹ کی بدولت جب ہندوستان

کے مختلف اطراف میں تین یونیورسٹیاں قایم ہو کر تمام دیسی زبانوں میں زبان انگریزی سے مختلف علوم کے ترجمے کئے گئے تو الفاظ اور خیالات کا ایک عجیب طومار پیدا ہو گیا۔ اسی پر گویا نظر ثانی ہو کر نئی نئی ارد و نثر کی بعض علمی تصنیفات شایع ہوئیں جو پہلے کچھ ناکمل سی تھیں۔ پھر وہی مکمل اور جامع ہو کر چھپنے لگیں مثال کے طور پر آبحیات ہی کو غور سے دیکھو اس میں شعر و شاعری کی حقیقت اور ماہیت کا تذکرہ محض ضمناً تھا۔ اور آزاد نے اس بحث کو بہت پھیلا کر نہیں لکھا تھا۔ کیونکہ اس کو صرف ارد و زبان کی تاریخ اور مشاہیر شعرا کے تذکرہ سے سروکار رہتا۔ حالی نے اس مضمون کو لیا اور اپنے دیوان کے مقدمے میں ۲۲۸ صفحوں کا محاکمہ شعر و شاعری کے متعلق قلمبند کیا اس پر شبلی نے مستفید ہو کر موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم میں حسن شعر کے متعلق وہ وہ نکتے پیدا کئے۔ جو آزاد اور حالی دونوں کو نہیں سوجھے تھے۔

غرض ابتدا ہمیشہ ایک حقیر اور چھوٹی سی بات سے ہوا کرتی ہے۔ آج مولانا آزاد کی تصنیفات سے یہ شکایت عموماً مستنبط ہوتی ہے کہ ارد و میں اخلاقی اور نیچرل نظمیں نہیں ہیں۔ شبلی افسوس کیا کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں تصوف کو ارد و نظم کا جامہ نہیں پہنایا گیا۔ حالی کہتے ہیں۔ کہ ارد و میں مثنوی کی طرف

مطلق توجہ نہیں ہوتی اس لئے ہمارے علم ادب میں رزم و بزم دونوں نہیں ہیں۔ اگر ان نقصوں کی حقیقت پر غور کرو۔ تو اصل وجہ یہ ثابت ہوگی کہ ہمارے ہاں استفادہ کرنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ غیر زبان سے کوئی نظم اپنی زبان میں اگر ترجمہ کی جائے تو وہ لطف قایم نہیں رہتا اور نہ وہ حسن کلام ہی پیدا ہو سکتا ہے یہ صحیح ہے مگر کسی نہ کسی طرح ابتدا تو کرنا چاہیے نثر میں ترجموں سے پہلے آغاز ہوا پھر آزاد۔ حالی۔ شبلی۔ نذیر احمد و سر سید احمد خاں اور ذکا اللہ وغیرہ نے دریا بہا دیئے۔ اور اس قدر علمی کتابیں اُن سے یادگار ہیں کہ صرف تیس چالیس سال کی مجموعی کوششوں سے جو ایام غدر کے بعد کی گئی اردو نثر فسانہ عجائب اور ادوے معلی کی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے مولانا حالی کی فلسفیانہ تحریروں شبلی کے تحقیقی لٹریچر اور نذیر احمد کی بلیغ طرز عبادت۔ سر سید کے سلیس اور موثر جملوں ذکا اللہ کے فصیح ترجموں اور مولوی محمد حسین کے مختص علم ادب تک کمال حاصل کر گئی اور ابھی اپنا قدم اور آگے بڑھا رہی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اردو نظم میں تا حال اس قسم کا استفادہ بہت کم ہوا ہے۔ غالب کے بعد صرف ایک شاعر اکبر الہ آبادی ہیں جنہوں نے عام اخباری واقعات۔ اور انگریزی اردو۔ فارسی

کی تمام ادبی کتابوں سے مفاد حاصل کرکے اپنی ایک خاص وضع کی شاعری کو رواج دیا جس کی ڈاکٹر اقبال نے صرف ایک چھوٹے سے رسالے میں تقلید کی ہے یا یوں کہو کہ اس سے استفادہ کرکے کچھ لکھا ہے مگر پھر مطلق اس طرف کچھ توجہ نہیں ہوئی۔ (ملاحظہ ہو اکبری اقبال)

استفادہ کی ایک مثال

انگریزی کے ایک قابل شاعر سودی نے دریا کی روانی کے متعلق مختصر سی ایک نظم لکھی تھی۔ اکبر نے اسی سے مستفاد ہوکر ایک نظم روانی دریا کے عنوان سے لکھی ہے اس میں آپ نے ترجمہ یا انتقال نظم یا بالفاظ دیگر استفادہ کرنے کے مشکلات کو اشارۃً بیان کیا ہے۔ یہ نظم ملاحظہ ہو۔

روانی دریا

وہ سودی سخن گوئے شیریں مقال | جو انگریزی شاعر تھا اک باکمال
لکھی اس نے ہی نظم اک لاجواب | دکھاتی ہے شکل روانی آب
جو بہتا ہے پانی میانِ لڈور | اسی کا دکھایا ہے شاعر نے زور

مناسب جو انگلش مصادر ملے
مقفیٰ کیے ان کے سب سلسلے

یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن
کہ میں بھی ہوں اس بحر میں غوطہ زن

دکھاؤں روانی دریائے فکر
کہ گوہر شناسوں میں ہو جس کا ذکر

عجب ہے نہیں ان کی اس پر نظر
کجا میں کجا سودئ نامور

سوا اس کے ہیں اور بھی مشکلیں
نہیں سہل اس راہ کی منزلیں

مرے پاس سرمایہ کافی نہیں
وہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں

زباں میں نہ وسعت نہ ویسا مذاق
ادھر تو ہے کچھ اور ہی طمطراق

اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط
معانی میں پیدا نہ ہو ربط ضبط

موانع یہ ہیں جن سے ڈرتا ہوں میں
مگر خیر کچھ فکر کرتا ہوں میں

جو تھیں دقتیں کہہ چکا برملا
غرض دیکھیے اب یہ پانی چلا

اچھلتا ہوا اور ابلتا ہوا
اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا

روانی میں اک شور کرتا ہوا	رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو ٹپکتا ہوا	چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا	یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
بھٹکتا ہوا غُل مچاتا ہوا	وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا	یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
ادھر جھومتا اور مٹکتا ہوا	ادھر گھومتا اور اٹکتا ہوا
بپھرتا ہوا جوش کھاتا ہوا	بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا
وہ اونچے سروں میں تموج کا راگ	وہ خود جوش میں آکے لانا یہ جھاگ
سدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا	تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا
لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا	یہ پھٹتا ہوا اور سمٹتا ہوا
یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا	اترتا ہوا اور چڑھتا ہوا
یہ ہٹتا ہوا اور وہ بچتا ہوا	دباتا ہوا اور لچتا ہوا

وہ روئے زمیں کو چھپاتا ہوا ‌‌ ‌‌ وہ خاکی کو سیمیں بناتا ہوا
گل و خار یکساں سمجھتا ہوا ‌‌ ‌‌ ہر اک سے برابر الجھتا ہوا
بہاتا ہوا اور بہتا ہوا ‌‌ ‌‌ ہوا کے طمانچوں کو سہتا ہوا
بلندی سے گرتا گراتا ہوا ‌‌ ‌‌ نشیبوں سے پھرتا پھراتا ہوا
اچکتا ہوا اور اڑتا ہوا ‌‌ ‌‌ اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا ‌‌ ‌‌ زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ نالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا ‌‌ ‌‌ وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا
یہ پھولوں کے گجرے بہاتا ہوا ‌‌ ‌‌ وہ چکر میں بجرے پھنساتا ہوا
لپکتا ہوا دندناتا ہوا ‌‌ ‌‌ امنڈتا ہوا سنسناتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا ‌‌ ‌‌ سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا ‌‌ ‌‌ حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا
تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا ‌‌ ‌‌ شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا

یونہی الغرض ہے یہ پانی رواں | بس اب دیکھ لیں شاعر نکتہ داں

وہ سودی کا سیلاب آب لڈو

یہ بحر خیالات اکبر کا زور

استفادہ کی دوسری مثال

مولانا اکبر کی وہ نظم جو اوپر درج ہوئی ہے مولوی سید عبد الغفور شہباز کی نظر سے گذری تو شہباز صاحب بھی اسی رنگ کو لے اڑے اور لفحوائے مثل دیئے سے دیا جلتا ہے۔ آب رواں کے عنوان سے ایک نظم مستفاد ہو کر تصنیف کی جس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

آب رواں
از سرچشمہ

الہ آباد ہیں خوبی سے آباد | (خدا رکھے ہمیشہ خرم و شاد)

ہیں میر اکبر حسین اک دوست میرے
وہ جن کی نظم نے موتی بکھیرے

طبیعت میں بلا کی ہے روانی
غضب جاری ہے اس چشمے کا پانی

رواں ہر چند ہوں یورپ میں نہریں
دکھائیں ہند کی یہ ان میں لہریں

فرنگی بحر گو آئینے لائیں
یہ ہندی شوخ کے جلوے دکھائیں

سمجھ لو سحر ہے کیسا بیاں میں
لڈور آیا چلا ہندوستاں میں

ہوئے سودی کے انگلش زرالبول سے
فصاحت آشنا اردو کے لہجے

کہاں ہیں چشمۂ سودی میں موجیں
یہ اردوئے معلیٰ کی ہیں فوجیں

لئے ہاتھوں میں تیغ موج صافی
جمائے ہیں پرے مصدر قوافی

مسلسل نظم جب میں نے یہ دیکھی
اٹھیں موجیں طبیعت میں خوشی کی

امنگوں پر چڑھیں دل میں امنگیں
ترنگوں پر ہوئی پیدا ترنگیں

قلمداں پر سخن کا ہاتھ لپکا
قلم سے بوندیں بن کر شعر ٹپکا

کہاں ہیں تشنہ کامانِ معانی
پئیں حاضر ہے آب زندگانی

(۲) بہاؤ

اڑا طرزِ خرام البیلوں سے — چلا آبِ رواں اٹھکیلیوں سے

کھلاتا کھیلتا ہنستا ہنساتا — تھرکتا ناچتا گاتا بجاتا

مٹکتا جھومتا تنتا اکڑتا — گرجتا گونجتا بنتا بگڑتا

جھلکتا جھلملاتا جگمگاتا — پھسلتا لڑکھڑاتا ڈگمگاتا

دکھاتا زور و غل کرتا کڑکتا — مچاتا شور ڈانٹ اٹھتا جھڑکتا

لپکتا دوڑتا پھرتی دکھاتا — اچھلتا کودتا چکر لگاتا

اچکتا پھاندتا گرتا ڈھلکتا — جھجکتا روٹھتا بھڑتا بھڑکتا

مچلتا پاؤں پھیلاتا ملکتا — سہمتا کانپتا روتا سسکتا

لرزتا تھرتھراتا تلملاتا — بلکتا بلبلاتا گڑگڑاتا

سمٹتا پھیلتا مڑتا مڑاتا — ابھرتا ڈوبتا اترتا اتراتا

کترتا چھانٹتا پرزے اڑاتا — کچلتا کوٹتا چھلکے چھڑاتا

الف ہوتا پڑا کاوے لگاتا | دولتی چھانٹتا پشتک اڑاتا
کبھی گھڑدوڑ میں کف منہ پہ لاتا | کبھی فوجوں میں گھس کر ہنہناتا
گریباں چاک کرتا سر پٹکتا | رگڑتا ایڑیاں دامن جھٹکتا
اٹھا کر سونڈ فوراہ اڑاتا | دھوئیں کے زور سے پارہ اڑاتا
تڑپتا لوٹتا چڑھتا اترتا | جھپٹتا باولا ہوتا بپھرتا
کھسکتا بھاگتا رکتا بھڑکتا | جھٹکتا جھاڑتا بنتا سنورتا
لپٹتا چھیڑتا چھوتا اچھلاتا | چھڑکتا چھینٹتا دھوتا دھلاتا
کبھی ڈنڈ پیلتا جوڑی ہلاتا | کبھی خم ٹھونکتا تیوری چڑھاتا
پہاڑوں کا کہیں دامن دباتا | درختوں کی کہیں شاخیں چباتا
صدف میں گوہر نایاب بھرتا | گہر کی شیشیوں میں آب بھرتا
مشبک چھاؤں کا پھندا بناتا | مسلسل موج کا نقشہ جماتا
زمرد پر کہیں پارہ بچھاتا | کہیں پارے کو فیروزہ اُڑھاتا

ستاری چھیڑتا ارگن بجاتا
ادھر حوریں ادھر پریاں نچاتا

الجھتا خار سے گل سے اٹکتا
چٹختا پھولتا دبتا شکتا

کٹر بجرے کو مرغابی بناتا
بشر کو مردم آبی بناتا

مکلف میز پر چادر بچھاتا
معلق شہر کو دعوت کھلاتا

شگوفہ چھوڑتا غصہ چڑھاتا
عداوت ڈالتا مینڈھے لڑاتا

کبھی کھیتوں میں شاخ زر لگاتا
کبھی منڈی میں زر کو پر لگاتا

جھلاتا جھولتا پینگیں بڑھاتا
کڑکتا چیختا تانیں لگاتا

بہک پڑتا سنکتا سنسناتا
اچک پڑتا لپکتا دندناتا

بڑھاتا ہر طرف موجوں پہ موجیں
چڑھاتا چار سو فوجوں پہ فوجیں

کبھی سیماب سے چاندی بناتا
کبھی چاندی پہ لے سونا چڑھاتا

پنھاتا شمس کو زرتار سائے
بناتا چاند سے چاندی کے پائے

کھلاتا روز و شب سورج کو غوطے
اڑاتا عقل کے ہاتھوں کے طوطے

زمیں کی گود میں گرداب بھرتا | بھنور میں تاند میں سیماب بھرتا

بناتا مورچے توپیں چڑھاتا | سجاتا پلٹنیں نوجیں بڑھاتا

نگلتا سیپیاں موتی اگلتا | جماتا قفلیاں سانچے میں ڈہلتا

گراتا پھینکتا چنتا اٹھاتا | چمٹتا چومتا پلتا سماتا

کبھی اوجوں پہ پھیلاتا تباہی | کبھی موجوں پہ چمکاتا سیاہی

کبھی پچکاریوں کا ڈالتا ڈھنگ | زباں بن کر کسی جا چاٹتا سنگ

کبھی پتھر سے ٹکراتا ہوا سر | کبھی ذروں پہ چمکاتا ہوا زر

نگینے سنگریزوں کے بناتا | طلسمی سرمہ آنکھوں میں لگاتا

(٣٣) سمندر اور اُس کی ہم آغوشی

غرض آب رواں یوں جہد کرتا | ہر ایک کوشش سے سو سو عہد کرتا

ہزاروں تارہ دم چشموں سے ملتا | کروڑوں پیارے ہم چشموں سے ملتا

جلو میں ندیوں نالوں کو لیتا | کروڑوں کشتیاں الفت کی کھیتا

سمندر

بڑی ہے اک عظیم الشان شے یہ
پڑے جس میں کروڑوں ان کہے ہے

ہزاروں جس میں مخفی گنج شاہی
کروڑوں جس میں اسرار الٰہی

زیادہ جس کی گہرائی خرد سے
عیاں جس کی اونچائی شد و مد سے

خیالوں سے بڑھا پھیلاؤ جس کا
سمیٹے خوبیاں سمٹاؤ جس کا

نگاہیں جس کا پایاں پا نہ سکتیں
حدیں جس کا سرا بتلا نہ سکتیں

فلک جس کے قدم سینے کو جھکتا
زمانہ جس پہ دم لینے کو رکتا

زمانے سے ہوا خواہ ابر جس کا
ہوا اک عاشق بے صبر جس کا

ستارے جس پہ شیدا ماہ مفتوں
بلا گرداں جس کا مہر گردوں

گھٹا چمکی ہوئی جس کی بدولت
شفق پھولی ہوئی جس کی بدولت

پہاڑوں کو جہاں روڑوں کا رتبہ
جہاں موروں سے کم گھوڑوں کا رتبہ

جہازوں کو جہاں قطرے نچاتے
چٹانوں کو جہاں ذرے پچاتے

جہاں ہر بوند بنتی بند ہیا چل — جہاں ہر موج جنتی سو ہما چل
جہاں طوفان نوح اک موج نوخیز — جہاں خود چشم قدرت حیرت آمیز

ہم آغوشی

عبارت مختصر - اٹھکے سنبھل کے — مطابق فارسی کی اس مثل کے
کند ہم جنس باہم جنس پرواز — کبوتر با کبوتر باز با باز
بنا آب رواں اک قلزم جوش
ہوا آخر سمندر سے ہم آغوش

حاشیہ سید عبد الغفور شہباز جس نے اکبر کی نظم پر یہ نظم لکھی تھی باڑھ ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے شعر کے بہار میں ایک خاص امتیاز رکھتے تھے مرحوم نے کلیات نظیر اکبر آبادی کو از سرنو مرتب کیا اور اسکو نیچرل شاعری کی کما حقہ داد دی۔ شہباز کا کلام خیالات شہباز کے نام سے چھپ چکا ہے۔ جو سب کا سب دیکھنے کے لایق ہے کیونکہ حالات و واقعات موجودہ سے استفادہ کرکے وہ اودھ پنچ کی ناز لیست خدمت کرتا رہا ہے۔ اور موجودہ پنچانہ منظوم لٹریچر کا موجد و مخترع ہے۔

یہ نظم سودی نے اپنے بچوں کی فرمایش سے لکھی تھی۔ اکبر نے اس میں حسن نظامی کی فہمایش کا حوالہ دیا ہے۔ انگریزی میں اس قسم کی نظموں کو جو بچوں کے دل بہلاؤ۔ اوران کی اخلاقی تعلیم وتہذیب کی نظر سے لکھی جاتی ہیں۔ نرسری رائمیس کہتے ہیں یعنی نظم الصبیان۔ زبان اردو میں کم عمر لڑکوں کے لئے اچھی اچھی نظمیں .... نہیں لکھی گئیں حالانکہ ترجمہ وتالیف میں ہمارا فرض خاص ملکی وقومی رنگ ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا لہٰذا ابتدی شعرا یا دوسرے درجے کے شاعر مصنفین کے لئے یہ ایک وسیع میدان ہے کہ وہ نظم الصبیان کی تصنیف میں طبع آزمائی کریں۔ عیدین یا عام تہواروں کے مواقع پر نظم الصبیان کی خاص ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ مگر ابھی تک جو نثر کے رسالے بچوں کے لئے ملک میں شایع ہوتے ہیں۔ وہی ایک آدھ نظم بچوں کی تفریح طبع کے لیے وقتاً فوقتاً لکھ دیا کرتے ہیں۔ مگر کوئی خاص مصنف اس طرف متوجہ نہیں ہوا۔ جس طرح فادر ٹیگ وغیرہ انگلستان میں شب وروز صغیر سن بچوں کے لئے محض منظوم لٹریچر تصنیف کرتے رہتے ہیں۔

غرض انگریزی لٹریچر اور ملک کے پنچ اخبارات اور عام حالات سے

مستفاد ہو کر اکبر نے اس کثرت سے شعر کہے۔ کہ زمانہ نے انکو لسان العصر کا خطاب عطا کیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر اکبر اودھ پنچ لکھنؤ کے نامہ نگاروں اور اس کو بہ نظر غائر مطالعہ کرنے والوں میں نہ ہوتے۔ تو ان کے اشعار میں ظرافت کا چٹخارہ اور ایک سنجیدہ ہزل و تمسخر کی لے ہرگز نہ پائی جاتی۔ اودھ پنچ کے بانی...... منشی سجاد حسین مرحوم علی گڈھ کی ینگ پارٹی پر اکثر مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ اکبر نے تمام عمر اسی مضمون کو نہایت خوبی سے نبھا دیا۔ بلکہ زمانہ موجودہ کے آزاد خیال نوجوانوں کے ساتھ تعلیم یافتہ مغربی فیشن کی خاتونوں کو بھی لے ڈالا مثلاً ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں | اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپکا پردہ وہ کیا ہوا | کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اور نوجوانوں سے یوں مخاطب کیا ہے ؎

اس طرف تو نے ہسٹری رٹ لی | اس طرف جل کے فلسفہ پھانکا
لیکن اکبر خیال عقبیٰ سے | نار و جنت کو بھی کبھی جھانکا

زمانہ حال کی عام لا مذہبی۔ ہندوستانیوں کی بے وفری۔ اور مسلمانوں کا ترقی جدید میں حصہ نہ لینا۔ یہ سب آج کل کے اخباروں کے معمولی مضامین

ہیں۔ انہی سے اکبر مستفاد ہوکر چار چار پانچ پانچ شعروں میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں کہ جن کی پوری تشریح کرنے کے لیئے دفتر درکار ہوں۔ وہ انگریزی نظموں اور انگریزی خیالات کو اردو بنانے میں ایک خاصہ ملکہ رکھتے تھے۔ چنانچہ خمخانہ جاوید جلد اول میں لکھا ہے کہ اکبر الہ آبادی فارسی وعربی کے علاوہ زبان انگریزی اور اس کے علم ادب سے بھی بخوبی ماہر ہیں اس وجہ سے جہاں تک ہوتا ہے مغربی خیالات کو بطرز احسن ایشیائی لباس پہنانے میں ساعی رہتے ہیں۔ اکثر مشاہیر انگلستان کے کلام کا اردو میں بہت ہی خوش اسلوبی اور عمدگی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔

حضرت اکبر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۶ء تک زیر تعلیم رہے۔ بیس اکیس برس کی عمر ہوگی۔ کہ شاعری کا چسکہ پڑا اور آتش کے شاگرد وحید الہ آبادی سے مشورہ سخن کرنے لگے اس وقت ان کا رنگ کلام جو کچھ بھی تھا وہ اس سے زیادہ نہ تھا۔ ؎

الفت جو کیجئے تو غرض آشنا سے کیا
وعدہ جو کیجئے تو بت بے وفا سے کیا

موسیٰ نے کوہ طور پر باتیں خدا سے کیں
رتبہ بشر کا دیکھئے ہوتا ہی کیا سے کیا

مرتا ہوں جان جاتی ہے اب ہجر میں مگر
اظہار اس کا کیجئے اس بے وفا سے کیا

غالباً سنہ ۱۸۸۴ء تک کبھی کبھی غزلیں بھی کہتے رہے مگر قدیم شاعری کے گوں یہ نہ تھے، چنانچہ اسی سال کی ایک غزل ہے جسمیں کوئی خوبی نہیں ہے

جو اس سرو قد سے جدائی ہوئی ہے	قیامت مرے سر پہ آئی ہوئی ہے
ذرا دیکھنا پھر انہیں چتونوں سے	یہ پیاری ادا دل کو بھائی ہوئی ہے
نہیں روئے رنگیں پہ زلفوں کا جلوہ	گلستاں پہ بدلی یہ چھائی ہوئی ہے

یہ پریشان گوئی ان کی پختہ عمر .... کی طبع آزمائی کا نمونہ ہے

اگر وہ اسی طرح غزل گوئی میں اپنی عمر ضایع کیا کرتے۔ تو شاید دہلی اور لکھنؤ کے موجودہ غزل خوان شعرا میں ہرگز گوے سبقت نہ لے جاتے۔ اس لئے انہوں نے اپنی قابلیت کو ایک اور میدان میں آزما کر دیکھا اور سنہ ۱۸۷۶ء میں جب کہ ان کی عمر تیس سال کے قریب ہوئی نیچرل شاعری کی طرف جھکے غالباً اسی زمانے میں اودھ پنچ نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرایا۔ اور حضرت اکبر نے نیچرل شاعری کا جو سبق ...... پنجاب یونیورسٹی کی جدید ادبی کوششوں سے سیکھا تھا۔ اس میں ایک ظرافت کا شاخسانہ لگا کر اپنی ایک جدید طرز ایجاد کی۔ ہم جن شعرا سے اس کتاب میں خطاب کیا چاہتے ہیں۔ ان کو اس مثال سے متنبہ ہونا چاہئے۔ اور قدیم غزل گوئی کو چھوڑ

کہ اکبر کی طرح شاعری کے کسی اور خاص میدان میں اپنی طبع آزمائی کر کے دیکھنا چاہئے۔ کہ آیا وہ کس قابل ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

اکبر نے ۱۸۷۶ء میں جو رنگ جدید اختیار کیا۔ اسکا ایک نمونہ یہ ہے ؎

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے | بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی | یورپ کا تری رگوں میں خون بھی ہے

آپ یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ صرف اکبر ہی نے حالات زمانہ سے یا پنچ اخبار و سے استفادہ کیا تھا۔ بلکہ ہمارا تمام اردو علم ادب ابتدا ہی سے فارسی شعرا کا ممنون احسان ہے۔ چنانچہ غزل گوئی جس کا خبط ولی سے لے کر آجتک پایا جاتا ہے۔ یہ فارسی شعرا کے کلام ہی سے متاثر ہو کر آغاز پذیر ہوئی تھی اور ہر ایک اردو گو شاعر کسی خاص فارسی گو شاعر کو اپنا نقطہ نظر قرار دیتا رہا ہے۔ مثلاً میر تقی اکثر شفائی کی طرز و روش کی تقلید کرتے ہیں۔ جیسے ایک غزل میں کہا ہے ؎

یہ غزل میر ہے شفائی کی
ہم نے بھی طبع آزمائی کی

خواجہ میر درد عموماً حافظ کو پیش نظر رکھا کرتے تھے اور قائم چاندپوری جو

میر و مرزا سے ہرگز کم نہ تھا۔ طالب آملی کا مقلد تھا۔ سودا نے قدسی وغیرہ سے استفادہ کیا تھا۔ متاخرین میں غالب نے۔ بیدل دہلوی۔ نظیری جلال اسیر اور ظہوری وغیرہ کا تتبع کیا ہے۔ لہذا۔ ایک شاعر کے لئے کسی اور بزرگ و برتر شاعر کے کلام سے مستفید ہو کر اپنا کوئی خاص رویہ تلاش کرنا۔ شروع کلام میں ہی لازم ولابد ہے۔ زمانہ قدیم میں مشاعروں۔ اور شعرا کے آپس میں معرکہ و مجادلہ کرنے سے ہر ایک مبتدی غزل گو خوب پہچان سکتا تھا۔ کہ آیندہ کس طریق پر اس کو چلنا چاہئے مگر آج کل استفادہ کیلئے بیسیوں وسایل ہم میں موجود ہو گئے ہیں۔ مثلاً

(۱) قومی و ملکی اردو گو شعرا کا نیچرل اور اخلاقی کلام۔

(۲) اخبارات و رسایل (اردو اور انگریزی)

(۳) انگریزی علم ادب کے تراجم وغیرہ۔

(۴) ملک ایران و مصر کے فارسی و عربی شعرا کا کلام۔

پس موجودہ اردو نظم کی توسیع اگر اس کو ایک مکمل علمی اور اخلاقی شاعری بنانا مقصود ہو تو محض انہی وسایل سے ہمارے شعرا کے مفاد حاصل کرنے سے ہو سکتی ہے ورنہ مولانا حالی نے جیسے اپنے دیوان کے مشہور مقدمے

میں لکھا تھا کہ شعرا کو دیوان میر تقی۔ سودا۔ جرات۔ ذوق اور آتش و ناسخ وغیرہ پڑھنے چاہئے۔ میری دانست میں اب ان دیوانوں کے خاص مطالعہ کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ ہاں دو ایک شعرائے قدیم کے کلام سے مثلاً میر تقی سودا۔ اور آتش و غالب وغیرہ کے دیوانوں سے اسلوب بیان میں کچھ مدد مل سکتی ہے۔ ورنہ خیالات جو نیچرل شاعری کی روح رواں ہیں ان کے لئے ان دیوانوں کا دیکھنا تک بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ خود نیچرل گو شعرا کا کلام اب اس قدر جمع ہو چکا ہے کہ مولانا حالی نے جب اپنا مشورہ پیش کیا تھا۔ اس کے پاس اتنا جدید سرمایہ اردو ہرگز موجود نہ تھا مثلاً کلیات اکبر کے تین حصے۔ مولانا حالی کے دیوان کے علاوہ اس کی بیسیوں نظمیں۔ ڈاکٹر اقبال کا تمام اردو و فارسی کلام۔ کلیات اسمعیل میرٹھی نظم آزاد۔ کلام یزدانی و بیان۔ خیالات شہباز۔ کلام محروم۔ کلام نیرنگ ناظر۔ مصنفات جوش ملیح آبادی۔ محوی۔ شوق۔ صفدر۔ محسن۔ نادر اور احمد حسین وغیرہ یہ سب جدید اردو شعرا اور ان کا کلام ہر ایک ادنیٰ و اعلیٰ شاعر کے لئے ہر قسم کی رہنمائی کو بالکل کافی ہے خصوصاً ضروریات حال کے مطابق مسلسل اخلاقی اور نیچرل نظمیں کہنا چاہو تو انہیں شعرا کے کلام

سے آج کل استفادہ کرنا پڑیگا۔ مگر یہ استفادہ کس طرح سے کیا جائے ہم اس کی ایک مثال اوپر درج کر چکے ہیں کہ حضرت اکبر کیونکر مستفید ہوئے اب قدرے باقی شعرائے جدید کا حال صفحات آئندہ میں درج ہوگا۔ لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے اکبر کا مختصر سا حال قلمبند کر دینا بہت موزوں ہے۔

اکبر الہ آبادی۔ پیدائش ۱۸۴۶ء وفات ۱۹۲۱ء

قریباً اکیس سال کی عمر تک دیسی مکاتیب اور انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کر کے پہلے ادنے وکالت کی سند حاصل کی پھر نایب تحصیلداری سے ترقی کرتے کرتے سب جج اور پھر سب جج سے جج درجہ اول عدالت خفیفہ مقرر ہوئے۔ .... سرکاری ملازمت میں ہمیشہ مصروف اور شعر و سخن کے عنفوان شباب ہی سے دلدادہ ہو گئے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب امام موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے نزدیک ان کے خاص قومی شاعر۔ ہندوؤں کے لئے۔ ایک باخلاق۔ اور بہ ہند ملکی شاعر اور عام اخباری دنیا کی نظر میں ایک اعلیٰ درجے کے سخرے

مگر باتہذیب ہجو گو شاعر تھے۔ آج کل کے نوجوان۔ انگریزی تعلیم یافتہ (فیشنیبل۔ اور آزاد خیال) بالخصوص ان کے تختۂ مشق تھے ایک نئے رنگ میں شیخ کو بھی خوب لتاڑا ہے۔ مولویوں لیڈروں سائنس کے شیدائیوں اور مذہب سے متنفر لوگوں پر بھی جابجا اپنے کلام میں حملے کئے ہیں بلکہ بعض اوقات کچھ کچھ فحش بھی کہہ گئے ہیں۔ مگر ظرافت کی چاشنی نے ان کی اس پاکیزہ و مہذب ہجو کو اور زیادہ مقبول عام کر کے چھوڑا ہے انہوں نے انگریزی الفاظ بکثرت اپنے اشعار میں بلا تزحب کھپائے ہیں۔ غرض ان کا تمام کلام فصیح۔ شستہ اور سلیس ہے دو۔ دو۔ چار چار شعروں میں ایک ایک مضمون ادا کر دیا ہے۔ اردو نثر پر بھی خاص دسترس تھی۔ کیونکہ ان کے خطوط کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں جن سے ان کی نثر نگاری کا کچھ پتہ چل سکتا ہے وہ اودھ پنچ میں نظم و نثر دونوں قسم کے مضامین بھیجا کرتے تھے تاہم نظم میں وہ اپنی ایک خاص اسٹائل (طرز شاعری) کے موجد ہیں جس کی ڈاکٹر اقبال نے کچھ تقلید کی۔ مگر کامیاب نہ ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ حضرت اکبر کو اودھ پنچ وغیرہ لکھنؤ کے ظریف پرچوں اور مضحک تصنیفات سے مدتوں استفادہ کرنے

کا اتفاق ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ ایک جوش فوری تھا جو کہ اکبری اقبال لکھ کر رہ گیا۔ ہم اس کی طرف ڈاکٹر اقبال کے تذکرے کے وقت متوجہ ہونگے۔ کلیات اکبر کے تین حصے شایع ہو چکے ہیں جن کو عام ملکی واقعات مطالعہ کرتے وقت زیر نظر رکھا جائے۔ تو ادبی رسالوں عام علمی محفلوں۔ اور سیاسی و قومی اخبارات کیلئے عمدہ سے عمدہ موثر و بانتیجہ نظمیں تصنیف کی جا سکتی ہیں۔

۲۔ شمس العلماء۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ پانی پتی

آپ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۳۰ دسمبر ۱۹۱۴ء کو وفات پا گئے ان کی لٹریری زندگی دو حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے پہلا وہ حصہ جب کہ متاخرین غزل گو شعرائے دہلی کا اثر ان کی طبیعت پر غالب تھا اور وہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ آزردہ۔ نیر رخشاں۔ علوی۔ اور مرزا غالب وغیرہ کی صحبت میں پرانی اردو شاعری کے دلدادہ تھے ۱۸۵۷ء یعنی ایام غدر تک انہوں نے اسی پریشان گوئی میں ابتدائی مشق کی۔ جب زمانے نے شرفائے اسلام کا تختہ الٹ دیا۔ تو آپ کو مجبوراً وطن چھوڑنا پڑا۔ اور

غدر سے کچھ مدت بعد آپ لاہور پہنچے۔ اور پنجاب یونیورسٹی کے سرکاری دارالکتب میں ملازم ہوئے۔ یہاں نیچرل شاعری کا آغاز حال ہی میں ہوا تھا۔ اس وقت مولانا محمد حسین آزاد بھی اورینٹل کالج اور محکمہ تعلیم پنجاب سے متعلق تھے ان دونوں پر جدید انگریزی تعلیم کا ایسا اثر پڑا کہ ایک نے ذوق اور دوسرے نے غالب کے تتبع کو خیرباد کہا۔ اور اخلاقی و عام ملکی مذاق کی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ حالی تو تھوڑی ہی مدت میں لاہور سے دل برداشتہ ہو کر چلے گئے۔ مگر آزاد نے لاہور ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ خواجہ حالی صاحب صرف چار سال پنجاب میں رہ کر دہلی چلے گئے تھے اور وہاں اینگلو عربک کالج دہلی کی مدرسی کرنے لگے تھے شہر

لاہور میں خواجہ صاحب کا قیام جس قدر کم ہوا تعجب ہے کہ اسی قلیل عرصے میں انہوں نے کیونکر اپنے آپ کو اتنا مسدس ہار لیا کہ عاشقانہ شاعری تو یک قلم ترک کر دی اور بقول مولف خمخانہ جاوید لالہ سری رام مسدس حالی کی بنیاد بھی لاہور ہی میں آپ نے ڈالی۔ تم جانتے ہو اس امر خاص کا محرک کون تھا؟ سرسید احمد خاں۔ اور ان کی قومی تحریریں اسی طرح حالی کی نیچرل شاعری کی بنیاد پنجاب یونیورسٹی کے اثر

آزاد کی ترغیب۔ اور لاہور کی اخباری دنیا کی بدولت ہوئی تھی۔ اگر مولانا حالی پریشان حال ہو کر لاہور نہ پہنچتے تو ممکن تھا کہ وہ جیسے قدامت پسند واقع ہوئے تھے تمام عمر ایک پریشان گو شاعر ہی کی حیثیت سے بسر کر دیتے غرض اپنے حالات زندگی اور ماحول سے مستفاد ہو کر شاعر اپنے طرز کلام کو کس طرح بدل سکتا ہے اور بہترین مدارج شاعری کو طے کر سکتا ہے۔ اس کیلیے مولانا حالی کی زندگی ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ وہ اپنی غزل گوئی کے کچھ نمونے دیوان حالی میں یادگار چھوڑ گئے ہیں جس سے ایک اقتباس مندرج ذیل ہے ؎

بری اور بھلی سب گذر جائیگی ۔۔۔ یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی
ملے گا نہ گلچین کو گل کا پتہ ۔۔۔ ہر ایک پنکھڑی یوں بکھر جائیگی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا ۔۔۔ کوئی دن میں گنگا اتر جائیگی

اسی زمین میں امیر مینائی اور داغ وغیرہ نے بھی غزلیں کہی ہیں مگر حالی اپنی غزلوں ہی میں عاشقانہ خیالات کے ساتھ ساتھ اخلاقی و فطرتی مضامین بھی شروع ہی سے لکھنے لگے تھے چنانچہ اسی غزل کے یہ اشعار ہیں۔ ؎

ادھر ایک ہم اور زمانہ ادھر | یہ بازی تو سو سو بئے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ | یہ عزت تو جائیگی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں ہوں گی | یونہی عمر ساری گذر جائے گی

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

مولانا حالی باوجودیکہ انگریزی نہیں جانتے تھے مگر اس زبان کے ترجم اور عام انگریزی خوان نوجوانوں اور اخباروں اور رسالوں وغیرہ سے استفادہ کرکے جس تصنیف پر قلم اٹھاتے تھے۔ اس کو کمال تک پہنچا دیتے تھے مثلاً مسدس حالی میں مسلمانوں کی حالت کو آئینہ کر کے دکھلا دیا حیات جاوید میں سرسید کی بیوگرافی ایسی مکمل و مستند لکھی ہے کہ اگر اس میں سرسید کے وہ خطوط جو بعد کو چھپے درج ہوتے تو اردو میں انگریزی کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا نمونہ بنتی۔ مختصر مثنویوں کا بہترین نمونہ مولانا حالی کی نشاط امید حب وطن برکھارت۔ اور مناجات بیوہ وغیرہ ہیں۔ رباعیات ان کے دیوان میں بکثرت موجود ہیں۔ اگر ان کا خلاصہ کر کے دیکھا جائے تو ان میں توحید۔ ترک شعر عاشقانہ۔ پیران

زندہ دل۔ دوستوں سے بے جا توقع۔ شراب اور جوانی۔ گفتار و کردار
میں اختلاف۔ اور موجودہ ترقی کا انجام وغیرہ۔ ایسی بیسیوں رباعیاں
نکلیں گی۔ جو محض اپنے ارد گرد کے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر مصنف
نے رواں دواں لکھ دی ہیں بھلا استفادہ کی بہترین نظیر اور کیا ہو
سکتی ہے۔ اردو میں سب سے اچھی رباعیاں دبیر اور انیس کی اور
کچھ کچھ سودا۔ میر درد۔ حاتم۔ اور مومن وغیرہ کی خیال کی جاتی ہیں لیکن
وہ زیادہ تر عشقیہ۔ غیر اخلاقی رباعیاں فارسی کے تتبع میں قلمبند ہوتی
تھیں آج کل کے واقعات اور حالات موجودہ سے متعلق صرف
خواجہ صاحب ہی کی رباعیاں ہیں جو ایک مجموعے میں علیحدہ بھی چھپ
چکی ہیں۔ خواجہ صاحب کا قومی کلام بے شک بے نظیر ہے۔ نظم میں
ان کی بیسیوں تصنیفات ہیں مگر مفصلہ ذیل وہ منتخب تصنیفات ہیں جو
شعرا کو بطور شمع ہدایت ہمیشہ اپنے مد نظر رکھنی چاہئیں (اور ان کو
دو بارہ سہ بارہ مطالعہ کرنے کے بعد ان کے بعض بعض حصے نوٹ
کر لیں تو استفادہ کی نظر سے نہایت قیمتی ہیں)۔

۱۔ دیوان حالی معہ مقدمہ۔ اس کے قطعہ بند قصیدے اور رباعیاں۔

۲- مسدس حالی - معہ ضمیمہ۔

۳- چہار گلزار حالی۔

۴- مثنویات مثلاً نشاط امید - برکھارت - حب وطن - رحم وانصاف

پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ - حقوق اولاد وغیرہ۔

۵- قطعہ بند اور سلسل نظمیں - مثلاً تحفۃ الاخوان - چپ کی داد -

پیام حالی - شکوہ ہند اور ننگ - خدمت۔

۶- قصیدۃ النباتیہ - جو موجودہ قصیدہ گوئی کا اچھا نمونہ ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے نثر میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں تالیف

وتصنیف کی ہیں جن میں یادگار غالب ان لوگوں کے لئے جو شعرو

شاعری سے کچھ مذاق رکھتے ہیں فی الواقع پڑھنے کے قابل ہے۔

مولانا حالی نے دو مرثیے بھی لکھے ہیں یعنی مرثیہ غالب اور مرثیہ حکیم محمود خاں

یہ دونوں ان کے دیوان میں موجود ہیں اُنکے ساتھ چودہری خوشی محمد

ناظر کا مرثیہ سر سید احمد خاں بھی ملالو - تو پھر ان تینوں مرثیوں سے

مستفاد ہو کر اردو میں بہتر سے بہتر دردناک مرثیہ تصنیف کرنا چنداں

مشکل نہیں رہتا کیونکہ زمانہ حال کے مطابق مشاہیر قوم کی وفات پر

کچھ لکھنا ہو تو ان سے بہتر اشعار ادب اردو میں ہرگز نہیں مل سکیں گے
خواجہ صاحب کا تمام کلام شایع نہیں ہے بلکہ جواہر حالی کے
نام سے ان کا کچھ بچا کھچا کلام بھی چھپ گیا ہے۔ اس لئے کوئی نمونہ
کلام یہاں درج کرنا فضول ہے تاہم ایک بند کا میرے دل پر کچھ ایسا اثر
ہوا ہے کہ خواجہ صاحب موصوف اس خاکسار کے مکان واقع موتی بازار
لاہور میں ایک دفعہ میرے بہین برادر ڈاکٹر کیپٹن غلام علی خاں صاحب
آئی۔ ایم۔ ایس سے اپنی آنکھوں کا اپریشن کرانے آئے تھے تو اس
وقت سے مجھے رہ رہ کے یاد آتا ہے اور کبھی بھولتا ہی نہیں ہے یہ
بند ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں پڑھا گیا تھا اہل دہلی کو
مخاطب کر کے مقتضائے حال کے موافق کیا اچھی نظم لکھی ہے۔
ملاحظہ ہو۔

ترکیب بند

یہ خاک آج جس پر ہیں جمع اہل آرا	یہاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا
اس باغ میں بہاریں جو جو گذر چکی ہیں	آنکھوں کے روبرو ہیں گویا سماں وہ سارا
کل جشن فتح تھا یہاں ہے آج جشن شادی	ہر دم عروج پر ہے اسلام کا ستارا
بلبن کہ آج مہمان خاقان ہیں اور سلاطین	اصطخر ہے کہ دلی بلبن ہے یا کہ دارا

فیروز شہ کی ہر کل بیٹھے سے آمد آمد
دولہا بنا ہوا ہے تو میں کی شہر سارا

تغلق کا آج لشکر تیمور کے مقابل
بہر دافعت ہے میدان میں صف آرا

مغلوں کے اٹھ رہے ہیں کل جشن فتح و نصرت
تیمور سے زمانہ ہے بر سر مدارا

آتا ہے آج بابر لودھی پہ فتح پا کر
ہیں مخلوق شاہ تو میں پیر و جواں خود آرا

کل سوبوں میں ہر سو بجتے ہیں شادیانے
مغلوں کا آرہا ہے گردش میں کچھ ستارا

ہے جشن فتح پھر آج چغتائیوں میں گویا
اقبال نے ہے گویا مغلوں سے قوم ہارا

جس دہوم سے ہے گھر گھر جشن جلوس اکبر
ہے گرد اس کے آگے جشن قباد و دارا

شاہ جہاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا
تعمیر ہو چکے ہیں شہر و فصیل و بارہ

تیاری اس خوشی میں جشن عظیم کی ہے
گویا کہ ہے جہاں میں جشن سدو بارا

اطراف ہند سے ہیں اعیان ملک آئے
پا کر حضور شہ سے سب جشن کا اشارا

ارکان سلطنت ہیں سب پائے تخت حاضر
بالائے تخت طاؤس ہے شاہ جلوہ آرا

وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں
پر جشن اُنکے اب تک سب زیب داستاں ہیں

ہندوستان کی تاریخ ہر ایک طفل مکتب آجکل پڑھتا ہے مگر جو واقعات اس سے انتخاب کر کے مولانا موصوف نے نظم کئے ہیں ان کا غوری اثر اہل دہلی

کے دلوں پر اپنی گذشتہ شان و شوکت یاد کر کے جس قدر ہوا ہوگا۔ اب اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ غالباً ہر ایک سمجھدار شخص ضرور ان اشعار سے آب دیدہ ہو گیا ہوگا۔ کیا عام سے عام مضامین میں سے مستفاد ہو کر ایک عمدہ نظم لکھنے کی مثال اس سے بہتر بھی کہیں دستیاب ہو سکتی ہے؟ اس میں کچھ شک نہیں کہ قومی نظمیں اس وقت بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ تاہم میں اپنے ناظرین کو مولانا حالی کے ان قطعوں کی طرف توجہ دلایا چاہتا ہوں جن کا حجم صرف ۴۷ صفحے ہے۔ اور دیوان حالی کا منظوم حصہ انہی قطعوں سے آغاز کیا گیا ہے۔ ان قطعوں کے عنوان ہیں چھوٹوں کا بڑا ہو جانا۔ شعر کی طرف خطاب۔ مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر۔ نکتہ چینی۔ بے تمیزی ابنائے زمان۔ اور پولیٹیکل اسپیچیں وغیرہ۔ یہ سب قطعے اخلاقی اور عام مذاق کے مطابق تصنیف ہوتے ہیں۔ اور مولانا موصوف ان کو وقتاً فوقتاً بعض اخباروں اور اپنے وقت کے علمی مشاغل سے استفادہ کر کے لکھتے رہے ہیں۔ اگر اس نوع میں ہمارے آج کل کے نوجوان شعرا کچھ مشق کیا کریں۔ تو ممکن ہے کہ اردو میں عام ملکی مذاق کی نظمیں بکثرت موجود ہو جائیں۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمان متاخرین شعرائے عشقیہ قومی اور

مذہبی نظمیں لکھ لکھ کر دفتروں کے دفتر بھر دیئے ہیں۔ مگر انسان کی طبیعت اختلاف کو بہت پسند کرتی ہے اب ایک اور رنگ یعنی خاص ملکی رنگ بھی ضرور اختیار کرنا چاہیئے کہ جس کے لئے ترکیب بند چھوٹے چھوٹے قطعے اور رباعیاں بہت موزوں ہیں۔ خصوصاً قطعات نہایت مناسب ہیں مثلاً مولانا حالی نیشن کی یوں تعریف کرتے ہیں ؎

یہ مانی ہوئی جمہور کی ہے رائے
اس پہ سارے جہاں کا اتفاق اب

کہ نیشن وہ جماعت ہے کہ از ہر
زبان جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب

مگر وحدت لے بعضوں نے دی ہے
نہیں جو مانتے ہیں اپنے مذہب

وہ نیشن ماسے کہتے ہیں اس جتھے کو کبھی
کہ جس میں وحدتیں مفقود ہوں سب

زباں اس کی نہ ہو مفہوم اس کو
ہوں آدم تک جدا رب کے بندے سب

جو دل احد الخنزیک اس کا خدا ہو
تو لاکھوں ایسے ہوں معبود و رب

ایک قطعہ استغنا پر لکھا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

بیچئے بھیک دوڑ کر گرہے گدا گری کا یہ
جس سے ملے جہاں ملے جو ملے از رہ بہ ث
ہے یہی اصل اکتساب ہو جیسے سب سے مستفید

زک ملے یا سزا ملے درس ملے ادب ملے

ایک اور قطعہ راست گوئی کے متعلق ہے۔

دیکھنے ہوں تمہیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تقریروں میں پاؤ گے نہ تحریروں میں
سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

راقم خاکسار نے ان قطعوں سے موثر ہو کر ایک اخلاقی قطعہ اس مضمون پر کہ خوشی وہ چیز ہے جو بعض اوقات بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ حالانکہ ایک غریب اکثر اس دولت سے مالا مال ہوتا ہے یوں تالیف کیا ہے

شاہ و گدا

مبتلا ایک مرض میں ہوا شاہ اسپین — سب یہ کہتے تھے کہ اب جینا ہوا اس کا محال
تھا خلل معدے میں سینے پہ خلش تھی پیہم — دل گھٹا جاتا تھا جتنی کہ بڑھی اسکی طحال
ڈاکٹر جمع ہوئے سب شہر کے بلوائے حکیم — سب نے دکھلائے جو اس فن میں وہ رکھتے تھے کمال
نہ ہوا جب کہ طبیبوں کی دواؤں کا اثر — جوتشی لگے وہاں آئے نجومی رمال
عمر ہے شاہ کی کتنی ابھی دیکھو باقی! — اہل تنجیم سے دربار نے پوچھا یہ سوال

متفق ہوگئے کہا سب نے نہیں شاہ کو مرض
نہ کوئی عارضہ ہم دیکھ چکے اسکی فال

دیو غم ہے کوئی سینے پہ چڑھا اسکے مگر
ہوگئی جس سے دہبت اس کی طبیعت بے حال

اہل دربار نے پھر پوچھا کہ کیا اسکا علاج
دیو غم کس طرح ہو سینے کا اسکے پامال

سب نے مل کر کہا اس درد کا ہے چارہ یک
سب کتابوں میں لکھا ہم نے یہی ہے احوال

واسطے شاہ کی اس شخص کا ہے آئے قمیص
نہ ہوا جسکو کبھی درد و غم و رنج و ملال

کی تلاش اسکی تو اک پایا فقیر آزاد
غم و غصہ کا تھا دل کو کبھی جس کے نہ خیال

پر نہ تھا تن پہ قمیص اس کے نہ کرتہ کوئی
خوش تھا وہ ننگا منگا یونہی رہتا تھا بحال

الغرض ہمدمے میں شاہوں کو بھی درپیش ملال
مال و دولت سے نہیں جاتا کبھی دل کا وبال

۲۔ شمس العلما۔ مولانا شبلی۔ مرحوم

گرچہ آپ طبعی شاعر نہ تھے۔ اور نہ بہ حیثیت شاعری ملک میں مشہور ہوئے چنانچہ انتخاب زریں[1] میں ان کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ اور نہ کشوف الشمسین[2]

---

[1] یہ تذکرہ سید رہی مسعود بی۔ اے ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات دکن نے شعرائے حال وجدید کے حالات پر لکھ کر شایع کیا ہے اور ابھی ابھی نکلا ہے۔ [2] کشوف الشمسین میں مولانا حالی و شبلی دونوں کے مرثیے اور ان کے مختصر سوانح قلمبند کئے گئے ہیں۔

مصنفہ احسن مارہروی میں ان کی اردو و فارسی شاعری پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ مگر میری دانست میں مولانا شبلی نعمانی ایک نہایت ذکی الحس اور قابل شاعر تھے اُن کا فارسی اور اردو کلام دارالمصنفین سے ہمیشہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ مختصر مجموعہ کلام شبلی اردو تو بہت ہی دلچسپ ہے۔

مولانا موصوف ایام غدر یعنی ۱۸۵۷ء میں بہ مقام اعظم گڈھ پیدا ہوئے فارسی اور عربی میں کامل دستگاہ پائی تھی۔ اردو زبان پر اس درجہ قدرت رکھتے تھے کہ ایک خاص قسم کی محققانہ، مورخانہ اور فلسفی طرز تحریر میں اہل تصنیف کے لئے وہ ایک نہایت ہی بلیغ نمونہ متصور ہوتے ہیں وہ دراصل ایک عالی شاعر تھے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مگر ایک طرف اسلامی تاریخ اور مشاہیر اسلام کی سیرتوں کا مطالعہ اور دوسری طرف شعر فہمی اور ہر قسم کی اردو فارسی نظموں کے حسن و قبح کی تحقیق کے جذبے نے جو بعد کو موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم میں اپنا رنگ دکھانے لگا۔ انہی دو اتفاقی باتوں نے مولانا کو شاعری کے دائرے میں لا ڈالا۔ یہ بھی گویا حالات و واقعات ذاتی سے استفادہ کرنے اور ان سے ایک خاص طرز شاعری اختیار کرنے کی بہترین مثال ہے۔ آج ہمارے ہاں صدہا غزل خوان شعرا

اسلامی وملکی تاریخیں دن رات پڑھتے ہیں اور معیار البلاغت بحر الفصاحت یا عروض سیفی وغیرہ ہر وقت رٹتے رہتے ہیں مگر ایک آدھ تاریخی یا قومی نظم لکھنے کا وقوف ان کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا کیا سبب ہے؟ محض یہ کہ وہ "استفادہ" کے فن سے ناواقف ہیں۔ اور اپنی حالت آپ بدلنے کا مطلق خیال ہی اپنے دل میں نہیں لاتے ورنہ آج تاریخی نظمیں قلمبند کرنے میں صرف ایک شبلی ہی کا نام پیش نہ کیا جاتا۔ ہزاروں شعرا ملکی یا اسلامی روایات لکھ چکے ہوتے کہ جن کے سامنے مولانا موصوف کا کچھ شمار بھی نہ ہوتا۔ مگر ہمارے شعرا میں جدت خیال جس قدر کم ہے اس سے بڑھ کر جدت طرازی اور ایجاد روش کے مادے کی بھی کمی ہے۔

مولانا حالی نے جو اسلامی و قومی نظمیں لکھی تھی وہ بہت جنرل اور کلیتہً (عالمگیر) ہیں۔ حالانکہ مولانا شبلی کی نظمیں خاص خاص اسلامی واقعات اور محض چند مشاہیر قوم سے مختص ہیں۔

جو نمونہ مجموعہ کلام شبلی نے پیش کیا ہے اگر اسی قسم کی متعدد کتابیں اردو میں اور تصنیف کی جائیں۔ تو پھر ہمیں بوستاں۔ سکندر نامہ۔ اور شاہنامہ جیسی کتابیں تصنیف کرنے میں کچھ دقت واقع نہ ہو۔ کیونکہ

بوستاں اصل میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہی ہیں جو حکیم لقمان، شاپور یا حجاج بن یوسف وغیرہ ایسے مختلف شخصوں کی منظوم سیرتوں سے لبریز ہیں۔ اسی طرح سکندر نامہ محض سکندر اعظم کی تاریخی داستان کو پھیلا پھیلا کر لکھ دیا گیا ہے۔ یا شاہنامہ میں رستم کے حالات و واقعات ہی نظم کئے گئے ہیں غرض اردو میں اس قسم کی مسلسل نظمیں جو کسی ہیرو کے کیرکٹر (اوصاف حمیدہ) پر حاوی ہوں۔ لکھے جانے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ فی الحال شبلی کا یہ رسالہ ہماری رہنمائی کو کافی ہے۔

اگرچہ انیس و دبیر وغیرہ مرثیہ گو شعراء نے بھی اسلامی روایات کو اس طرح نظم کیا ہے کہ شہدائے کربلا کے اعلیٰ خصائل دل پر نقش ہو جاتے ہیں مگر ان نظموں میں عمومیت کی بجائے ایک گروہ اسلام کی خصوصیت کا رنگ بہت پایا جاتا ہے۔ تاہم ملکی روایات (خواہ اسلامی روایات ہوں یا مسلمانوں کے علاوہ اور ہندوستانی قوموں کی روایات) کو نظم کرنے کی استعداد ان سے بخوبی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہندوں اور مسلمانوں کے سینکڑوں ہیرو ہیں۔ مثلاً رامچندر جی۔ شہنشاہ اکبر اور گرو نانک

وغیرہ مگر ان کی منظوم بائیوگریفیاں اب تک مفقود ہیں۔ ہاں نثر میں ان کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر نظم میں تاحال قومی و ملکی روایات کا مضمون بالکل اچھوتا ہے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اس وقت ملک میں دو قسم کے شاعر بہت عام ہیں ایک تو وہ جو پریشان گوئی اور غزل گوئی سے سروکار رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو عام ادبی رسایل و اخبارات کے لیے اکثر اخلاقی اور عام ملکی مضامین نظم میں لکھا کرتے ہیں اگر ہمارے غزلگو شعرا قافیہ پیمائی کو آیندہ ترک کردیں۔ اور اسی طرح ادبی رسایل کے شاعر نامہ نگار بھی کچھ تھوڑی سی مدت توجہ دے کر اپنے ملک یا قوم کی تمام اعلےٰ سیرتوں اور کیرکٹروں کو نظم کر ڈالیں۔ تو اسی ادنیٰ ابتدا سے پھر ہمارے ہاں اردو میں بھی رامائن مہابھارت۔ ہومر کا ایلیڈ۔ اور فردوسی کا شاہنامہ وغیرہ ایسی ضخیم کتابیں نظم میں موجود ہو جائیں۔ بصورت دیگر ادب اردو میں محض چھوٹی چھوٹی نظمیں مثلاً مثنویاں اور ترجیع بند وغیرہ رائج رہیں گے۔ اور کوئی کلاسیکل نظم اردو میں ہرگز موجود نہیں۔ پائی جائیگی مولانا شبلی کے ادبی کارنامے متعدد تاریخی تصنیفات اور مختلف مسلسل

مضامین ہیں۔ جن سے ہم کو یہاں سروکار نہیں ہے۔ اور نہ ان کی فارسی نظموں پر کچھ لکھنا مقصود ہے۔ ہاں اردو میں ان کا ایک مجموعہ کلام اور اپنے بڑے بھائی کا دردناک مرثیہ ہے۔ جن کو مولانا نے اپنا خاص رجحان طبیعت اور اپنی قوت نظم اچھی طرح دیکھ کر بھال کر لکھا ہے۔ اور اسلوب بیان میں زیادہ تکلف یا بعید استعاروں سے ہرگز کام نہیں لیا ہے۔

مولانا شبلی کی سوانح عمری

۱۸۵۰ء میں متولد ہوئے۔ شفیق باپ نے ان کی تعلیم اور تربیت پر بہت توجہ کی۔ یہ فراغ تحصیل کے بعد دیوانی میں ملازم ہوئے۔ مگر سرکاری ملازمت راس نہ آئی اور اس کو چھوڑ کر علی گڈھ تشریف لے گئے جہاں پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں سرسید کی رفاقت اور ارنلڈ صاحب کی دوستی میں مولانا شبلی ایک بڑے آدمی بن کر ہندوستان میں ایک فرد روزگار سمجھے جانے لگے۔ آرنلڈ نے علامہ شبلی سے مستفاد ہو کر پریچنگ آف اسلام مرتب کی۔ انہوں نے صاحب موصوف سے قدرے فرنچ زبان

تحصیل کی۔ مولانا شبلی نے کچھ مدت علی گڑھ کالج میں بسر کی اور ۱۸۹۸ء کے بعد جب کہ سرسید نے انتقال کیا۔ تو مولانا بھی حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں سلسلہ آصفیہ قایم ہوا۔ جس سلسلے میں آپ نے موازنہ انیس و دبیر کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں تالیف و تصنیف کیں۔ ان کی تنخواہ اس وقت ریاست میں تین سو روپیہ ماہوار تھی۔ اور ان کو حیدر آباد دکن چھوڑنے کے بعد بھی کچھ وظیفہ تا زیست ملتا رہا۔ پھر لکھنؤ میں ندوۃ العلما کی سرپرستی آپکے متعلق ہوئی۔ اس میں بہت عرصہ تن دہی سے کام کرتے رہے اور رسالہ الندوہ میں بیسیوں مذہبی و اخلاقی مضامین انکے شائع ہوتے رہے۔ بعد ازاں اہل ندوہ کی کشمکش کے سبب آپ اس سے علیحدہ ہوگئے۔ ایک دفعہ شعر العجم کی تالیف میں مصروف تھے جو یکایک ایک بھری ہوئی بندوق چل گئی اور اس سے آپ کا ایک پاؤں صاف اڑ گیا۔

ان کے بڑے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب وکیل ہائی کورٹ تھے ان کی وفات کا مولانا کو سخت رنج ہوا۔ اور ایک مرثیہ اردو میں لکھا۔ جس کے کچھ شعر یہ ہیں ؎

آج افسوس کہ وہ نیر تاباں نہ رہا | میری جمعیت خاطر کا وہ ساماں نہ رہا

اب وہ شیرازہ اوراق پریشاں نہ رہا | آہ وہ والد مرحوم کا دربان نہ رہا۔

گلہ خوبی تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

یہ بھی اے جان برادر کوئی جانیکا ہے طور | اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا تیرے اوج کا دور | کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کے بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

ایک بند کا آخری شعر ہے۔

اب وہ مجموعہ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں

مولانا نے تاریخی کتابیں ہی لکھ کر مسلمانوں کی خدمت نہیں کی بلکہ عملی طور پر بھی کئی انجمنوں اور قومی مجلسوں کے سرگرم ممبر رہے۔ آپنے قانون وقف اولاد کے سرکاری طور پر مرتب کئے جانے میں بڑی ملکی خدمت سرانجام دی تھی اعظم گڈھ میں دار المصنفین کی عمارت اور لائبریری کے قیام کے علاوہ تالیف و تصنیف کا وہ اعلیٰ انتظام کیا کہ وہ علمی انسٹیٹیوٹ

بہت خوش اسلوبی سے اب تک جاری ہے۔ کانپور کی مسجد کے واقع نے جب مسلمانوں کو سیاست کے دائرے میں ڈال دیا۔ تو علما اور جوا قوم میں شاید مولانا شبلی ہی نے سب سے زیادہ اس رو کا ساتھ تھا حالانکہ وہ موڈریٹ خیال کے ایک واجب التعظیم بزرگ تھے۔ ان کی تصنیفات اگرچہ بکثرت ہیں۔ مگر ہمارے مخاطب شعرا کو مفصلہ ذیل ضرور پڑھنی چاہئیں۔ مثنوی صبح امید۔ سوانح عمری مولانا روم۔ موازنہ انیس و دبیر شعر العجم ۴ جلد۔ اور مجموعہ نظم شبلی۔

مولانا شبلی نے یورپ۔ مصر۔ اور شام وغیرہ کا بھی سفر کیا تھا مگر کشمیر میں سیر کرنے کو گئے تھے کہ بخار چڑھا اور وہاں ۵۔ اگست ۱۹۱۴ء کو رحلت پاگئے۔

آپ کے عام حالات زندگی اور طریق بود و باند سے صاف وضح ہوتا ہے کہ آپ ہرگز شاعر بننا نہیں چاہتے تھے یا اس طرف ان کی دلی توجہ مطلق نہ تھی باایں ہمہ جو نظمیں مولانا شبلی نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں وہ ان شعرا کے لئے۔ جو قومی روایات یا بعض ملکی مسائل سادہ طور پر نظم کرنا چاہیں ایک اچھا نمونہ ہیں مثلاً ؎

کافروں نے یہ کیا جنگ احد میں مشہور ۔۔۔ کہ پیمبر بھی ہوئے کشتۂ شمشیر دو دم
ہو کے مشہور مدینہ میں جو پہنچی یہ خبر ۔۔۔ ہر گلی کوچہ تھا ماتم کدۂ حسرت و غم
ہو کے بیتاب گھروں سے نکل آئے باہر ۔۔۔ کودک و پیر و جوان و خدم و خیل و حشم
وہ بھی نکلی کہ جو تھیں پردہ نشینان عفاف ۔۔۔ جن میں تھیں سیدۂ پاک بھی با دیدۂ نم
موقع جنگ پہ پہنچی تو یہ لوگوں نے کہا ۔۔۔ کیا کہیں تجھ سے کہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں ہم
تیرے بھائی نے لڑائی میں شہادت پائی ۔۔۔ تیرے والد بھی ہوئے کشتۂ شمشیر ستم
سب سے بڑھ کر یہ کہ شوہر بھی ہوا تیرا شہید ۔۔۔ گھر کا گھر صاف ہوا ٹوٹ پڑا کوہ الم
اس ضعیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا ۔۔۔ یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہ امم
سب نے دی اسکو بشارت کہ سلامت ہیں حضور ۔۔۔ گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو و شکم
بڑھ کے اس نے رخ اقدس کو جو دیکھا تو کہا ۔۔۔ تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہیں سب رنج و الم
ہیں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا ۔۔۔ اے شہ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

اس اخلاقی نظم میں ایک ملکی مذہبی یا قومی لیڈر پر اپنی جان تک قربان کر دینے کا کیا اچھا سبق ہم کو سکھایا گیا ہے۔

مسلم لیگ۔ لکھنؤ

اس نظم میں ہماری قومی انجمنوں اور لیگوں کے ممبروں کو یہ نصیحت کی گئی

ہے کہ وہ صرف ظاہری رسم و رسوم سوسائٹی ہی کے پابند نہ رہیں۔ بلکہ جس بات کا بیڑا اٹھائیں وہ اسکو اپنی عملی کوشش سے تا بہ اختتام پہنچانے کی طرف بھی ہمیشہ ساعی رہا کریں۔

لیگ کی شہرت و عظمت سے ہے کس کو انکار
ملک میں غلغلہ ہے شور ہے کہرام بھی ہے۔
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پر عنایت کی نگاہ
نظر لطف رعیاں خوش انجام بھی ہے
کون ہے جو نہیں اس حلقۂ قومی کا اسیر
اس میں زہاد بھی ہیں رند مے آشام بھی ہیں
فیض ہے اس کا باندازہ طالب یعنی
بادہ صاف بھی ہے دردِ تہ جام بھی ہے
کعبۂ قوم جو کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
مرجع خاص ہے یہ قبلہ گہ عام بھی ہے
پختہ کاروں کے لئے آلہ تسخیر ہے یہ
نوجوانوں کو صلائے طمع خام بھی ہے

رہنمایان نوآموز کا ہے مکتب درس
زینۂ فخر و نمایش گری عام بھی ہے

جن مہمات میں درکار ہے ایثار نفوس
ان میں طرز عمل بوسہ بہ پیغام بھی ہے

صدمۂ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پر آب
دل میں غمخواریٔ ترکانِ نیکو نام بھی ہے

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو ہیں یہ
محسن قوم بھی ہے خادم حکام بھی ہے

ربط ہے اس کا گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی
جس طرح صرف میں اک قاعدہ ادغام بھی ہے

اس کمرے میں بھی ہے ہر طرح کا سامان درست
ورقِ سادہ بھی ہے کلک خوش اندام بھی ہے

ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو
جابجا دفتر پارینۂ احکام بھی ہے

دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے | کہ کوسوں تک زمیں پر فرشِ دیبائے مشجر تھا
دلہن کی پالکی جو اپنے کندھوں پر چڑھا لائے تھے | وہ ظلِ سبحانی اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا
یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی | کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا،
کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا،

نوجوانوں سے خطاب

کیے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہدِ شباب اپنا
اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ ہیں تم سے
جواں ہو تم لبِ بام آچکا ہے آفتاب اپنا

مولٰینا شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں جمہور شعرا کے خلاف دبیر کو ایک مبتذل شاعر ثابت کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر ناکام رہے اس بحث کو المیزان مولفہ سید نظیر الحسن فوق میں غور سے مطالعہ کریں تو بہت مفید ثابت ہوگی۔

لے شبلی کے قطعات صرف اخبار البلال کلکتہ کے لئے لکھے جاتے تھے ملاحظہ ہو اردوئے معلیٰ مئی ۱۹۱۵ء

الجزو الثالث

انتخابِ کلامِ مشاہیرِ شعرائے اردو قدیم

مع

تذکرہ و تبصرہ موسوم بہ

بیاضِ نغزش

اردو زبان میں غزل گو شعرائے کے بیسوں مستند تذکرے اس وقت موجود ہیں۔ جن میں مندرجہ ذیل لحاظ کے قابل ہیں۔ تذکرہ آبحیات گلشنِ بیخار۔ گلستانِ سخن۔ نغمۂ عندلیب۔ انتخابِ یادگار۔ سخنِ شعرا۔ سراپا سخن۔ شمیمِ سخن۔ تذکرۂ شعرائے دکن۔ تذکرۂ شعرائے پٹنہ۔ طبقاتِ الشعرائے شوق۔ تذکرۂ قاسم۔ تذکرۂ مصحفی۔ تذکرۂ منولال شمعِ سخن۔ مجموعۂ یوسفی۔ ریاضِ فردوس۔ تذکرہ نواب کلب حسین خان نادر طورِ کلیم۔ طرازِ عشق۔ غنچۂ ارم۔ تذکرۂ شبستانِ عالمگیری۔ آثار الشعرا

چمنستان کشمیر - مجموعۂ سخن - تذکرہ گلشن ہند جلوۂ خضر - نکات الشعرا
فرح بخش طبقات الشعرا (مولوی کریم الدین) - تذکرہ شعرائے ہنود -
تذکرہ شعرائے بدایوں - تذکرہ شعرائے ٹونک - تذکرہ ضیغم - تذکرہ مولوی
مظہر الحق - وغیرہ وغیرہ - ان میں سے اکثر تذکرے میری نظر سے گذر
چکے ہیں - اور حال ہی میں دو تین اور عمدہ تذکرے مثلاً خمخانۂ جاوید ۲ جلد
انتخاب زریں - اور تذکرۂ میر حسن وغیرہ شایع ہوئے ہیں - مگر افسوس
ہے کہ ان سب تذکروں میں محض "غزل" گو شعرائے اردو کا معیار کمال
تصور کیا گیا ہے - اس لئے اس بیاض میں بجز معدودے چند تذکروں
مثلاً "آبحیات - اور انتخاب زریں وغیرہ کے اور کسی سے کچھ سروکار نہیں رکھا
گیا ہے - کیونکہ ہمارا روئے سخن انہی شعرا کی طرف ہے کہ جنہوں نے
خواہ زمانہ گذشتہ میں یا حال میں بعض اوقات ایسے شعر بھی لکھے ہیں جو
اخلاقی یا نیچرل شاعری سے متعلق ہیں - مثلاً نظیر اکبر آبادی - ایک بہت
پرانا غزل گو شاعر ہے - اور اس کی زبان بھی سوقیانہ قرار دی گئی
ہے - تاہم اس بیاض میں اس کی ایک آدھ اخلاقی نظم ضرور شامل
کر لی گئی ہے - حالانکہ اس کے مقابلے میں ریاض گورکھپوری ایک

نہایت قابل اور لسان شاعر ہے۔ مگر وہ ہمارے کس کام کا۔ جبکہ اس کے کلام میں ایسی مسلسل نظمیں جو اخلاقی۔ قومی یا کسی قدرتی سینری وغیرہ کے متعلق تصنیف کی گئی ہوں نام کو بھی نہیں پائی جاتی۔

غرض جذباتِ فطرت۔ نیچرل و قومی اشعار اور عام اخلاقی و علمی نظمیں جو اعلیٰ سے اعلیٰ ادب اردو میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ وہ سب اس بیاض میں جمع کی گئی ہیں۔ اگرچہ اس قسم کی مفید نظموں کا ایک وسیع انتخاب علیگڈھ سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ مگر اس میں بعض بعض معمولی خیال کی نظموں کو بھی کتاب کا حجم بڑھانے کے لئے جگہ دی گئی ہے۔ حالانکہ موجودہ انتخاب میں ہر ایک شاعر کی صرف دو ایک ایسی نظمیں منتخب ہو کر درج ہونگی۔ کہ اُن سے بہتر اس شاعر کے دیوان یا مجموعہ تصنیف میں یا اس کے قلم سے کبھی نکلی ہی نہ ہوں۔ مثلاً ذوق اور غالب کی اچھی سے اچھی غزلیں عام تذکروں میں قلمبند کی گئی ہیں۔ مگر میری یہ ذاتی رائے ہے کہ اگرچہ غزل میں ذوقؔ اور غالبؔ کے برابر یا ان کے کچھ قریب قریب حال کے شعرا نے بھی غزلیں کہہ ڈالی ہیں۔ لیکن جو پہلے پہلے مرزا غالب نے کہا اور پھر اس کی تقلید ذوق نے کی۔ باوجودیکہ

صدہا شعرائے اس بارے میں بہت سعی و کوشش بھی کی ہے۔ مگر ویسے سہرے پھر کبھی تصنیف نہیں ہوئے۔ لہذا اس بیاض میں صرف ایسے ہی نادر الوجود مگر مفید اشعار انتخاب ہو کر درج کئے جائینگے جیسے یہ سہرے

چونکہ انگریزی زبان میں اس قسم کی صرف ایک آدھ لاجواب نظم شاعر کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیتی ہے۔ ہم بھی محض انہی نظموں کو اس مجموعہ میں شامل کرینگے۔ کہ جن سے ہمارے شعرائے اردو کا نام زمانہ آیندہ میں قائم و دائم رہنے والا ہو۔ اس لئے اس انتخاب میں بعض ایسے شاعر بھی نظر آئینگے۔ کہ جنکو زیادہ تر اردو علم ادب کے ماہوار رسالوں یا اخباروں میں کسی مختصر مگر عمدہ اخلاقی و ملکی نظم کے تعلق سے دیکھا گیا ہو عام اس سے کہ وہ ابھی ایک گمنامی کی حالت میں ہیں اور ملک کے شہرا آفاق شعرا کی فہرست میں انکا نام تاحال نہیں لیا گیا ہے۔

اس بیاض کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ امیر خسرو کے ایک ادنی انمل سے لیکر ڈاکٹر اقبال کی آخری نظم طلوعِ اسلام ۱۹۲۳ء تک زبانِ اردو نے جو جو رنگ بدلے ہیں وہ ایک ہی نظر سے دیہ بیاض مطالعہ کرنیکے بعد صاف صاف واضح ہو جاتے ہیں۔ گویا اردو زبان میں بہتر سے بہتر

اخلاقی شاعری کی یہ ایک مکمل تصویر ہے۔ جو کہ اس سے پہلے شاید کبھی کھینچی ہی نہیں گئی۔ یا اگر کھینچی بھی گئی ہے تو اس کا نکتہ نظر ہرگز وہی نہیں ہے جو کہ اس بیاض کے مؤلف نے مقصود رکھا ہے۔ پس اس مختصری تمہید کے بعد اب اس بیاض کا آغاز کیا جاتا ہے۔ فہو ہذا :۔

امیر خسرو

(وفات سنہ ۱۳۲۵ء یا سنہ ۷۱۵ھ ہجری)

اُردو زبان کی ابتدا امیر خسرو سے ہوئی۔ جو کہ سنہ ۱۳۲۵ء میں فوت ہوا۔ لہذا اردو نظم کا آغاز سنہ ۱۳۰۰ء کے قریب قریب سمجھنا چاہیے۔ اور اسوقت سنہ ۱۹۲۳ء ہے۔ اس حساب سے اُردو چھ سو برس کی ایک پرانی زبان ہے۔ مگر اس کی ادبی تاریخ سے صاف صاف پایا جاتا ہے کہ اُردو جب ترکوں کے عہد میں عام طور پر ملک میں جاری ہوئی۔ تو پھر اس کی ترقی شمالی ہندوستان میں بوجہ تیموریوں اور مغلوں کے حملوں کے اور خصوصاً مغلوں کے ساتھ زبانِ فارسی کی عام ترویج و ترقی کے اسقدر رُک گئی۔ کہ جبتک یہ قومیں برسرِ اقتدار رہیں۔ اُردو یا کسی دیسی زبان کو ہرگز

فروغ حاصل نہیں ہوا۔ مگر شاہجہان کے زمانے میں جبکہ مسلمانوں نے اپنی ہر ایک خصوصیت کو ایک امتیاز دلانا چاہا۔ اور شہر دہلی نئے سرے سے آباد کیا گیا۔ تو محض حسن اتفاق سے بعض مسلمانوں کو اردو کیطرف ایک خاص توجہ ہوئی۔ اور وہ زبان جو امیر خسرو کے عہد سے متروک چلی آتی تھی۔ پھر بول چال میں مستعمل ہونے لگی۔ عموماً کہا جاتا ہے۔ کہ اس وقت دہلی میں ایک بازار اہل لشکر کے لئے مخصوص کیا گیا تھا جو "اردو" یا "اردو بازار" کہلاتا تھا۔ اس میں بھانت بھانت کے لوگ جیسے کہ چھاؤنیوں میں ہوا کرتے ہیں۔ جمع ہو کر جو زبان آپس میں بولا کرتے تھے۔ وہ اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔

ممکن ہے کہ یہ بات صحیح ہو۔ مگر ترکی زبان میں اردو کے معنے صرف بازار ہی کے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہجوم ایک انبوہ کو بھی کہتے ہیں لہذا اردو کے ساتھ ایک "اردو بازار" کی کچھ تخصیص نہیں ہے۔ یہ عوام ہند کی زبان تھی۔ بلا تخصیص مذہب و ملت۔ اور یہ اب بھی اسی طرح تمام ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ زبان ہے قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلجیوں اور تغلقوں کے زمانہ

حکومت میں امیر خسرو کو سرکاری طور پر اس زبان کی ترویج کے لیے بعض درسی کتابیں مثلاً خالق باری وغیرہ تالیف کرنے کا حکم ہوا۔ اور اس نے اس کتاب کے علاوہ غزلیں۔ گیت۔ دوہے۔ انمل۔ دوسخنے۔ اور پہیلیاں وغیرہ بھی خاص اسی غرض سے تصنیف کی تھیں۔

زمانے نے خسرو کا وہ اردو کلام جو عوام کی عقل و فہم سے کچھ بالا تھا۔ بالکل معدوم کردیا۔ اور صرف وہی قائم رکھا کہ جس سے چھوٹے چھوٹے بچوں۔ لڑکے لڑکیوں اور ہمارے گھروں کی بوڑھیا عورتوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ ابتک موجود ہے۔ اور یہ ہمیشہ موجود رہیگا کیونکہ اس سے بہتر دوسخنے۔ انمل۔ اور پہیلیاں وغیرہ ادب اردو میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔

انگریز جب اس ملک میں آئے تو ان کو بھی یہ ضرورت لاحق ہوئی تھی کہ وہ اپنے ہم قوم لوگوں کو اردو زبان سے واقف کریں اسی غرض سے انہوں نے کرنیل گلکرسٹ کو منتخب کیا تھا کہ جس نے اردو کو ایک ایسی حالت میں پایا کہ جس میں نثر کی درسی کتابیں خال خال تھیں۔ لہذا باغ و بہار۔ چہار درویش۔ اخوان الصفا

اور بیتال پچیسی وغیرہ کیسی کتابیں فارسی اور سنسکرت یا بعض قدیم زبانوں سے تالیف و ترجمہ کی گئی۔ لیکن امیر خسرو کے عہد سے پہلے زبانِ اردو کبھی عام بول چال کی حد سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ لہذا اس نے جو کام کیا۔ وہ کرنیل گلکرسٹ (جسکو حکومت نے بیسیوں اسسٹنٹ اور ممد و معاون بھی دے رکھے تھے) کی ادبی کارگذاریوں سے زیادہ سخت مشکل تھا۔ مثلاً اسکو ادنی ادنی ڈھکوسلوں اور انملوں سے لیکر اسوقت کے لحاظ سے بہت اعلیٰ درجہ کی غزلوں تک خود تصنیف کرنی پڑیں تاکہ یہ زبان علمی حیثیت سے ملک میں رائج ہو جائے۔ حالانکہ انگریزوں کو ایک بنی بنائی زبان ہاتھ آگئی۔ اور صرف معدودے چند کتابیں خاص اپنے مطلب کی انکو تالیف کروانی پڑیں۔ لہذا اسطور ذیل میں امیر خسرو کا کچھ کلام جواہر خسروی سے مستعار لیکر یہاں درج کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ لوگ جو زبانِ اردو کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ دیکھیں کہ ایک عام ملکی زبان کی ابتدا کیونکر ہوا کرتی ہے۔

ڈھکوسلے

انمل یا ڈھکوسلا ایک ہی بات ہے۔ یعنی کوئی بے معنی اور مہمل کلام۔ مگر تعجب ہے کہ کوئی ایسی بات کہ جسکا کچھ حاصل حصول یا مطلب نہ ہو وہ عوام میں رواج ہی کیونکر پا سکتی ہے۔ خیر امیر خسرو کا ایک یہ ڈھکوسلا زمانہ قدیم سے مشہور چلا آتا ہے:۔

"کھیر پکائی جتن سے ۔ چرخہ دیا جلا"
"آیا کتا کھا گیا ۔ تو بیٹھی ڈھول بجا"

مولینا آزاد نے آبحیات میں اور حالی نے اپنے مقدمہ شاعری میں اسکو ایک مہمل کلام یعنی ڈھکوسلا بتایا ہے۔ اور اس کی نسبت یہ روایت بھی لکھدی ہے۔ کہ ایک کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو کو رستہ چلتے پیاس لگی۔ کنوئیں پر جاکر ایک سے پانی مانگا۔ انمیں سے ایک انہیں پہچانتی تھی۔ اس نے اوروں سے کہا کہ دیکھو خسرو یہی ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا تو خسرو ہے جسکے

سب لوگ گیت گاتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں! اسپر ایک اُن میں سے بولی کہ مجھہ کو کھیر کی بات کہدے۔ دوسری نے چرخے کا نام لیا تیسری نے ڈھول اور چوتھی نے کتے کا۔ انہوں نے کہا کہ پیاس کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔ پہلے پانی تو پلادو۔ وہ بولیں جبتک ہماری بات نہ کہدیگا۔ پانی نہ پلائینگی۔ انہوں نے جھٹ کہا ؎

کھیر پکائی جتن سیتی الخ۔ لیکن ذرا غور کیا جائے تو یہ کلام مہمل نہیں ٹھہرسکتا میری دانست میں اُردو زبان کی اسوقت ابتدا تھی۔ اور اسکی قوتِ بیانیہ اُسوقت تک استوار نہ ہوئی تھی۔ امیر خسرو نے اپنے اس ڈھکوسلی میں (جو اوپر لکھا گیا ہے) یہ مراد رکھی ہوگی۔ کہ عورتوں ہی کی زبان سے ایک عورت اپنی کسی سہیلی یا ساتھ والی سے کہتی ہے کہ تیرے لئے بڑے جتن سے کھیر پکائی تھی۔ حتی کہ چرخے تک جو عورتوں کو اسقدر محبوب ہوتا ہے اسکو بھی جلا کے کھیر پکائی۔ مگر بدبختی یہ ہوئی کہ کتا کہیں سے پہنچ گیا۔ اور وہ سب کھیر چاٹ گیا۔ اب تو بیٹھی ڈھول بجا۔ یعنی بیہودہ شور و غوغا مچایا کر۔ تیری قسمت میں وہ کھیر لکھی ہی نہ تھی۔ چونکہ زبانِ پنجابی میں "تو بیٹھی ڈھول بجا" بیفائدہ واویلا کرنے کو کہتے ہیں

اسلئے اہل زبان اس رباعی کو بخوبی سمجھنے سے عاری ہیں - اور انہوں نے اسکو ڈھکوسلا لکھا ہی - پس انمل یا ڈھکوسلا کوئی چیز نہیں ہے اور نہ امیر خسرو کے بعد کسی اور شاعر سے کوئی ڈھکوسلا کبھی منسوب ہوا ہے ہاں دوسخنے ایک بامعنی کلام ہے - اور صنعت ایہام کی ایک ابتدائی صورت ہے - خسرو نے نہایت عمدہ دوسخنے تصنیف کئے ہیں - جنمیں سے چند ایک یہ ہیں :-

دوسخنے

انار کیوں نہ چکھا - وزیر کیوں نہ رکھا (جواب) دانا نہ تھا

گوشت کیوں نہ کھایا - ڈوم کیوں نہ گایا (جواب) گلا نہ تھا

ککڑی کیوں چھوٹی - لکڑی کیوں ٹوٹی - (جواب) بودی تھی

راجہ پیاسا کیوں - گدھا اداسا کیوں (جواب) لوٹا نہ تھا

ستار کیوں نہ بجا - عورت کیوں نہ نہائی (جواب) پردہ نہ تھا

دیوار کیوں ٹوٹی - راہ کیوں لوٹی - (جواب) راج نہ تھا

گھر کیوں اندھیارا - فقیر کیوں بڈارا - (جواب) دیا نہ تھا

روٹی جلی کیوں - گھوڑا اڑا کیوں - پان سڑا کیوں (جواب) پھیرا نہ تھا

نِسبتیں

شلجم اور کپڑے میں کیا نسبت ہے۔ (جواب) جالی

گہنے اور درخت میں کیا نسبت ہے (جواب) پتا

دریا اور گہنے میں کیا نسبت ہے۔ (جواب) مگر

مکان اور پاجامے میں کیا نسبت ہے۔ (جواب) موری

گھوڑے اور بزاز میں کیا نسبت ہے (جواب) تھان

موجودہ شعرائے اردو میں ان دو سخنوں یا نسبتوں کا رواج مطلق نہیں ہے۔ مگر ان کے عوض نظم میں ایہام گوئی اور نثر میں ضلع جگت لکھنے کا دستور کہیں کہیں پایا گیا ہے۔ چنانچہ اماؔنت لکھنوی کی تمام شاعری ایہام گوئی پر انحصار رکھتی ہے۔ اور رتن ناتھ سرشار نے اپنے فسانوں میں بعض بعض مقامات پر ضلع جگت یا تلازمہ کو بہت اچھیطرح سے برتا ہے۔

دو سخنہ فارسی و ہندی

۱۔ سوداگر بچہ را چہ مے باید۔ بوچے کو کیا چاہیئے (جواب) دوکان

۲۔ تشنہ را چہ مے باید۔ ملاپ کو کیا چاہیئے۔ (جواب) چاہ (کنواں و محبت)

۳۔ شکاری را چہ مے باید۔ مسافر کو کیا چاہیئے (جواب) دام (جال و پیسہ)

۴۔ شکار بہ چہ باید کرد۔ قوتِ مغز کو کیا چاہیئے (جواب) بادام (جال و بادام)

۵۔ کوہ چہ میدارد۔ مسافر کو کیا چاہیئے۔ (جواب) سنگ (پتھر اور ساتھ)

۶۔ باربرداری را چہ مے باید۔ کلاونت کو کیا چاہیئے۔ جواب) گاؤ

۷۔ قوت روح چیست۔ دوست کو کب دیکھیئے (جواب سدا۔ صدا (آواز۔ ہمیشہ

پہیلیاں

چیستانیں اور پہیلیاں سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں میں پہلے موجود تھیں۔ مگر خسرو نے اسمیں بھی ایک ایجاد کی۔ یعنی کہہ مکرنی

کہی مثلاً بندر کی پہیلی ہے :-

آنکھ چلاوے بھوں مٹکاوے	ناچ کود کے کھیل کھلاوے
دوڑ جھپٹ جا بیٹھا اندر	اے سکھی ساجن نا سکھی بندر

اس قسم کی پہیلی کو جب کسی مخاطب سے حل کرنے کے لئے کہا جائے۔ تو "اے سکھی ساجن نا سکھی" تک کہہ کر چپ ہو جانا چاہیئے۔ مخاطب لفظ اندر پر غور کریگا کہ اس کا ہم وزن کون لفظ ہماری زبان میں ہو سکتا ہے۔ وہ جب کہیگا کہ "بندر" تو پھر یہ کہہ مکرنی حل ہو جائیگی۔ غرض بوجھ پہیلیوں میں جواب اس پہیلی کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اور بن بوجھ پہیلی میں جواب شامل نہیں ہوتا۔ مگر کہہ مکرنی ان سے مختلف ہے۔ جیسا کہ ابھی واضح کیا گیا ہے۔

بوجھ پہیلیاں

(آری)

اِدھر کو آوے اُدھر کو جاوے	ہر ہر پھیرے کاٹ وہ کھاوے
ٹھہر رہتی جب وہ ناری	خسرو کہے وہ رے کو آری

(آری)

شیام برن اور دانت انیک - لچکت جیسے ناری
دونوں ہاتھ سے خسرو کھینچے - اور یوں کہے تو آری

(آئینہ)

فارسی بولی آئی نا | ترکی ڈھونڈی پائی نا
ہندی بولی آرسی آ | خسرو کہے کوئی نہ بتا

(بٹی)

ٹوٹی ٹوٹ کے دھوپ میں پڑی جُوں جُوں سُوکھی ہُوئی بڑی

(چھتری)

گھوم گھمیلا لہنگا پہنے ایک پاؤں سے ایسے کھڑی
آٹھ ہاتھ ہیں اس ناری کے صورت اسکی لگے پری
سب کوئی اس کی چاہ کریں گبر و مسلماں ہندو چھتری
خسرو نے یہ کہی پہیلی دل میں اپنے سوچ ذری

بن بوجھ پہیلیاں

(آری)

آنا جانا اُس کا بھائے۔ جس گھر جائے لکڑی کھائے

(آسمان)

ایک تھال موتیوں سے بھرا۔ سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اُور وہ تھالی پھرے۔ موتی اس سے ایک نہ گرے

(آئینہ)

کیا جانوں وہ کیسا ہے | جیسا دیکھو ویسا ہے
ارتھ تو اس کا بوجھیگا | مُنہ دیکھو تو سوجھیگا!

انار (آتشبازی)

رات سمے اک میوہ آیا۔ | پھولوں پاتوں سب کو بھایا
آگ دئے وُہ ہووے رُوکھ | پانی دئے وہ جاوے سُوکھ

بے کا گھونسلا

اچرج بنگلا ایک بنایا — اوپر نیو تلے گھر چھایا
بانس نہ بلّی بندھن گھنے — کہو خسرو گھر کیسے بنے

کہہ مُکرنیاں یا کہہ مُکریاں

(تارا)

رات سمے وہ میرے آوے۔ بھور بھئی وہ گھر اُٹھ جاوے
یہ اچرج ہے سب سے نیارا۔ اے سکھی ساجن نا سکھی تارا

(طوطا)

سبز رنگ اور منہ پر لالی۔ اس پیتم گلا کینٹھی کالی
بھاؤ سبھاؤ جنگل میں ہوتا۔ اے سکھی ساجن نا سکھی توتا

(ڈھول)

وہ آوے تب شادی ہوئے۔ اس بن دُوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگیں وا کے بول۔ اے سکھی ساجن نہ سکھی ڈھول

(کتا)

ٹٹی توڑ گھر میں آیا | ارتن برتن سب سرکایا
کھا گیا پی گیا دے گیا بتا | اے سکھی ساجن نا سکھی کتا

(جوگی)

وہ وارے مورے الکھ جگاوے | بھبھوت برہ کی انگ لگاوے
سینگی پھونکت پھرے بیوگی | اے سکھی ساجن نہ سکھی جوگی

امیر خسرو کا اردو کلام جس میں زیادہ تر پہیلیاں ہیں جواہر خسروی کے نام سے (مطبع انسٹیٹیوٹ علیگڈھ) طبع ہو چکا ہے۔ لہذا زیادہ اقتباسات درج نہیں کئے گئے۔ چیستاں گوئی میں امیر خسرو کا کمال فن اور یکتائی اس سے ظاہر ہے کہ سودا اور ظفر جیسے قادر الکلام شعرا نے بھی پہیلیاں کہی ہیں۔ مگر کچھ جدت پیدا نہیں کر سکے مثلاً سودا

باز کی پہیلی ؎

بعضی بات کہی نہ جاوے۔ ناری ہو کر نر کہلاوے

بندوق کی پہیلی ؎

کارامنہ اور کار اگات - بن بھوجن وہ کرے نہ بات - نت اٹھ مار جورو کھائے - بول بول سب سبھا رجائے -

ظفر ؎ باوری سی اک نار ظفر وہ سب کے جی کو بھاتی ہے پنکھہ نہ واکے نہ پکھیرو بن پنکھوں اڑجاتی ہے - پاؤں نہ پائے واکے بن پاؤں اڑجاتی ہے - رنگ نہ دیکھا واکا پر کیا ہی رنگ وکھاتی ہے - یہ پہیلی ہوا کے متعلق ہے -

ایک اور پہیلی بھی اسی مضمون پر ظفر نے کہی ہے ؎

چنچل نار سبھا میں آئے - آتے جاتے کوئی نہ پائے - مل جل کے وہ سب سے جائے - کہو مورکھ وہ کیا کہلائے -

کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ

سنہ ۱۰۲۵ ھ

جنوری سنہ ۱۹۲۲ء کے رسالہ اردو میں سلطان موصوف کے کلمات ریختہ کا ایک اقتباس درج ہوا ہے - جس کے متعلق ارکان انجمن

ترقی اردو کی رائے ہے کہ یہ اکبر کے عہد کی اردو زبان ہے۔ کیونکہ سلطان قطب شاہ اکبر کا ہم عصر تھا۔ لہذا خسرو کے بعد اگر اُردو نظم کا کوئی نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ تو وہ یہی ہے۔ لیکن میری دانست میں خسرو سے بھی کچھ پہلے اور اس سے تھوڑی سی مدّت بعد جو کلام اُردو کا نمونہ کہلانے کا مستحق ہے۔ وہ پنجابی زبان کے اشعار ہیں مگر افسوس ہے۔ کہ اسوقت پنجابی نظم لکھنے پڑھنے میں نہیں آئی تھی جیسے کہ اب بھی پنجابی نثر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اور نہ تعلیم یافتہ پنجابی اصحاب اپنی زبان کی منظوم کتابوں کو کبھی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ لہذا یہ زبان ہمیشہ بول چال ہی تک محدود رہی۔ البتہ گرونانک وغیرہ بزرگانِ دین نے اس میں جو دہرے اور گیت نظم کئے ہیں۔ وہ اب تک پائے جاتے ہیں۔ مگر مصنف آبحیات ان کو ادب اُردو سے غیر متعلق بتاتا ہے۔ لہذا ہم بھی انکو یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔ تاہم اتنا ضرور کہینگے۔ کہ ترکوں کی سلطنت جب ہندوستان سے جاتی رہی تو اُردو بھی ایک ادبی حیثیت سے بالکل گر گئی۔ اور وہ صرف عام فقرا کی زبان

پر جاری رہی - کیونکہ انہی کو زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں سے متفقہ طور پر واسطہ پڑتا تھا - لہذا امیر خسرو کے بعد اہل دکن کا اُردو نہیں - بلکہ بابا تلسی داس - بھگت کبیر - گرو نانک اور بابا فرید وغیرہ کا کلام توجہ کے لائق ہے - چنانچہ اُردو زبان کے یورپین محققین نے ان فقرا کا لٹریچر ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا ہے اور اس کو ادب اُردو کی عام ترویج اور استحکام کا ایک خاص باعث قرار دیا ہے - مگر چونکہ ان بزرگوں نے اپنے اشعار کو علم ادب کی اشاعت کے خیال سے کبھی تصنیف نہیں کیا تھا - بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے - لہذا ہم اسپر کچھ زیادہ لکھنا مناسب نہیں سمجھتے -

کلیاتِ قطب شاہی

اس میں اردو زبان کی جو تصویر پیش کی گئی ہے - وہ اگرچہ امیر خسرو کی پہیلیوں سے زیادہ صاف - واضح اور دل کو لبھانے والی نہیں ہے - لیکن اہل تحقیق کا قول ہے کہ ترکوں کے زمانے

ہیں جب کہ دہلی کے باشندے دیوگڈھ یعنی دولت آباد میں منتقل کیے گئے۔ تو وہ اپنی زبان کو دلی سے دکن میں اپنے ساتھ ہی لیتے گئے۔ اور اس زبان نے وہاں بہ نسبت دلی کے زیادہ ترقی کی۔ لیکن انصاف سے دیکھا جائے۔ تو امیر خسرو کا جس قدر کلام اب بھی موجود ہے۔ وہ فصاحت۔ بلاغت اور زبان کی شستگی اور سلاست میں کسی دکنی شاعر کے کلام سے ہرگز کم نہیں ہے لیکن ان محققین ادب اُردو کی تائید کرتے ہوئے ہم اس قدیم دکنی شاعر کا اُردو کلام اس جگہ نقل کرتے ہیں۔ سلطان محمد قطب شاہ نے ایک شاہی باغ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے یہ چند اشعار ہیں ؎

محمد نانوں تے بستا محمد کا لے بن سارا	سو طوباں سوں سہانا ہی جنت نمنے چمن سارا
ہے فانوس کے درمیانے تے جون جوت دیوا کیا	سو تیوں دستا دُولاں ہیں تھی میوہ یا کابرن سارا
ہی دم عیسوی دائم چمن میں گل لگانے تیں	ہرے نہالاں کے جلوے تیں مشلیبوں پون سارا
سڑک سی باغ کو دیکھت کھلے منج باغ کے غنچے	سوں اس غنچے کے باساں تھی لگیا مگ مگمن سارا

چمن کے پھول کھلے دیکھ سکھاں کا مکھ یاد آیا | کیہا تا تھا محمد پھل نمن اُن زمین سارا
دسے نا سک کلی جنا بہواں دو پات ہیں تس کے | بھنوتیل دیکھ اس جا کا ہوا حیران من سارا
سو خوشبو دا کہہ لاکھاں کے تئیں یا سنبلا ہوون | سو ہی اس نوں اکھ مینڈوا سو جیبا سبز کہن سارا
اناراں میں سو ہی دانے سو جوں یاقوت دُبیاں میں | ہر ایک پھل اس انار ان پرے ہے سکے نہ من سارا
کھجوراں کے دیسیں جھمکے کہ جوں مرجان کے پہنچے | سپاریاں لعل خوشی جل دیسیں دُن ہوبن سارا
دسیں نارنگی پھل یوں زمرد مرتبان حل | ہوا سکے تاج کو کھتا ہی پیالا کر دکھن سارا
دسیں جامو کے پھل بن میں نیلم کے نمن سالم | نظر لا کے تینوں میویاں کوں رکھیا ہی حقن سیلا

یہ نظم جس لمبے بحر میں موزون کی گئی ہے وہ زبان پنجابی میں عام ہے۔ اور اس کا مفہوم مجھے امید نہیں ہے کہ اہل زبان اچھی طرح سمجھ بھی سکتے ہوں۔ مگر چونکہ اسکو ارکان انجمن ترقی اردو میں سے مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے سیکرٹری انجمن موصوف

نے ولی دکنی سے بہت پہلے کی اردو کا نمونہ خیال کیا ہے۔ اب ہم اسکو
اسی طرح تسلیم کر کے اس کی تشریح قلمبند کرتے ہیں۔ مطلع ہے ؎
محمد ناؤں تھے بتا محمد کالے بن سارا ؛ سو طوبان سوں سہلاناہی جنت نمنے چمن سارا
اس جگہ "تھے" خالص پنجابی لفظ ہے جو کبھی سے کے معنی میں بولا جاتا
ہے۔ جیسے محمد ناؤں تھے یعنی محمد کے نام سے۔ اور کبھی اسکو "تے" کہا
جاتا ہے۔ اور یہ "تے" یا تیں عموماً زائدہ بھی ہوتا ہے۔ (جیسے انگریزی
میں "دی" عموماً زاید استعمال کی جاتی ہے)۔ اور کبھی اس کے
معنی اور کے بھی لئے جاتے ہیں۔ اسکی مثالیں زبان پنجابی میں یہاں
لکھی جاتی ہیں۔

۱۔ میں تے تو کل چلے آئے۔ یعنی میں اور تو کل چلے آئے۔
۲۔ میں تھے اے مصیبت نہیں اٹھیگی۔ یعنی مجھ سے یہ مصیبت برداشت
نہ ہوگی۔ یہ ملتانی لہجہ ہے۔
۳۔ ڈنڈ پیلنا ہور تے کھانا تے گھورنا۔ تیرا اچھا نہیں۔ اس فقرے
میں ہور کے معنی اور ہے اور اس کے آگے "تے" زاید ہے۔ پس
اس مطلع کے یہ معنی ہیں کہ محمد نام ہے اور اس نام سے ایہہ یعنی اے

یا یہ سارا جنگل اور بن آباد ہے - یہ چمن سو (صد) طوبی (یہ لہجہ پنجابی طوباں لکھا ہے) سے زیادہ سہانا ہے -

اس قصیدے میں پنجابی الفاظ اس کثرت سے موجود ہیں کہ اگر یہی دکنی زبان اردو کی اصل تسلیم کی گئی ہے - تو پھر اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ دکنی اور پنجابی میں کچھ یونہی سا فرق باقی رہجاتا ہے - مگر چونکہ ہندو اور مسلمان سب سے پہلے صدیوں تک پنجاب ہی میں مل جلکر رہے اور پھر دہلی سے ہوتے ہوئے دکن پہنچے - لہذا پنجابی زبان پر بہ نسبت دکنی کے اردو کی اصلیت بتائے جانے کا زیادہ حق پہنچتا ہے - ہم اس قصیدے کے بعض الفاظ کی تشریح اپنی پنجابی زبان کے مطابق یہاں پیش کرتے ہیں - جس سے یہ سارا انتخاب بخوبی سمجھا جاسکیگا - ملاحظہ ہو دوسرا شعر - اس میں لفظ "دسے" بہ معنی دکھائی دیتا ہے - سو (پس) تیوں - اسی طرح دستا - دکھائی دیتا :: دولاں - یعنی دو طرفہ -

تیسرا شعر ہے - بہ معنی چلتی ہے - دم عیسوی - نسیم یا صبا :: ہرے نہالاں کے جلوے تین یعنی سبز سبز پودوں کے رنگ

سے مشاطیوں یون سارا بمعنی پانی میں عکس نظر آتا ہے۔
چوتھے شعر میں لگیا جاگ نمگن سارا۔ یہ ایک پنجابی فقرہ "جگمگان لگ گیا ہے"۔

ساتویں شعر میں داکھہ خالص ہندی یا پنجابی ہے۔ بہ معنی انگور۔
اسیطرح ایک اور دکنی شاعر نے ۱۲۰۶ھ میں قصہ ملکہ مصر تصنیف کیا ہے۔ اسکی زبانی بھی سطور ذیل میں ملاحظہ ہو۔

سنو اب یو قصہ سب اظہار کر
کہتے یک شہنشاہ اتھا بختور
دھرے نام فیروز سلطان شاہ
اتھا مصر کے تخت کا بادشاہ
اُسے ایک دختر سو اچپل اتھی
چندر سوں بھوت خوب نرمل اتھی
ملیکہ اچھے نام اس نار کا
اتھا شور جگ میں اوس نار کا
وسے نار کا مکھہ جوں خورشید نور
تھی اچپل نزاکت لطافت میں پور
کیتی دیس بعد از بحکم قضا
بقا کوں چلیا شاہ لے رب تھیں رضا
بزان جو وزیراں اتھی خاص و عام
کیا شاہ کو دفن یک خوش مقام

سبھی مل وزیراں اپین کر بچار
ملیکہ کے سر بادشاہی قرار

اس نظم کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ ایک بادشاہ تھا بخت ور فیروز شاہ اس کا نام تھا۔ وہ مصر کا فرمانروا تھا۔ وہ جب وفات پا گیا۔ تو اس کی ایک نہایت خوبصورت بیٹی وزیروں کے مشورے سے تخت پر بٹھا دی گئی۔

یہ نظم دکنی زبان میں ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی سے بھی گئی گذری ہے۔ سلطان قطب شاہ نے دسویں صدی ہجری میں جو اردو لکھا تھا۔ گویا یہ اس پر ترقی شدہ بارھویں صدی کا دکنی اردو ہے۔ مگر اس قسم کے دکنی نمونوں سے بابا نانک کا یہ دوہرہ جو پنجابی زبان میں ہے اور جسکو مصنّف آبحیات نے نستر کر دیا ہے ہزار مرتبہ بہتر۔ اور اردوئے قدیم کا اچھا نمونہ ہے یعنی ے

سانس ماس سب جیو تمہارا۔ تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر ایہو کہت ہے۔ سچّے پروردگارا

مولٰینا آزاد اس کو چارسو برس کی پرانی پنجابی کا ایک نمونہ بتاتے ہیں۔ حالانکہ یہ ان دکنی نمونوں کی زبان سے زیادہ تر صاف۔ سلیس اور فصیح ہے جو کہ اوپر درج ہوئے ہیں۔ لہذا اہل زبان

کو تاریخ اردو کی تحقیق کے لئے آئندہ دکن یا دکنی زبان کی طرف نہیں
بلکہ ملک پنجاب اور پنجابی علم ادب کی طرف رُخ کرنا چاہیے۔

(حامد پنجابی)

تذکرہ آبِ حیات میں اس شاعر کا محض ایک مطلع لکھکر مولینا آزاد
نے مُنہ پھیر لیا ہے۔ اور یہ سمجھا کہ کوئی پنجابی بزرگ ہیں۔ ان کی
نظم کی طرف کچھ التفات نہیں کی۔ حالانکہ ان کی زبان پنجابی ہی
اور ان کی حامد باری جو عرصہ دراز تک مکتبوں میں جاری رہی۔
اس نے لوگوں کے دلوں پر پنجاب کی اردو شاعری کا سکہ ضرور
بٹھا دیا تھا۔ پس ان کے کمال سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔
دیکھو اُن کی یہ نظم جو سطورِ ذیل میں درج ہوتی ہے۔ صرف اسی
ایک نظم سے شاعر کی تمام لیاقت کا اندازہ لگانا صحیح نہیں ہے
اگر ان کا تمام کلام اس وقت موجود ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے۔ کہ

پنجاب کو دکن پر کیونکر ترجیح دلائی جاسکتی ہے جبکہ حامد کی یہ زبان ہے

غزل

عزم سفر جو کردی ساجن | نینوں نیند نہ آئے جی
قدرِ وصالت نہ دانستم | تم بن برہ ستائے جی
موسم وقت بہار رسیدہ | گل خندہ جائے نہ جائے جی
تم بن یہ گلزار و گلستاں | مجھ نہیں ساجن بہلائے جی

اسی غزل یا قطعہ کا دوسرا بند ہے جس میں لکھا ہے

صبر بکن تا چند ایامی اے دلِ خستہ حامد باری

حمد بگو با حضرتِ باری تو مجھ آن ملاؤ جی!!

یہ اشعار گو ایک پنجابی کے قلم سے نکلے ہیں۔ مگر اسوقت کی دکنی اُردو کے نمونوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں تو مجھ۔ تم بن مجھ نہیں خالص اُردو ہیں۔ ——— (بحوالہ آب حیات)

شمس ولی اللہ۔ ولی دکنی

۱۱۱۲ھ

میر تقی نے تذکرہ نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ ولی جب دکن ہیں آیا۔ تو شاہ سعد اللہ گلشن سے فیضِ سخن حاصل کیا۔ پھر دکن میں جاکر شعرائے فارسی کے نمونے پر اپنا دیوان مرتب کیا۔ جس کو اردو کا سب سے پہلا دیوان اشعار قرار دیا گیا ہے۔ اور پھر اسی (ولی ۱۱۱۲ھ کے قریب دہلی میں پہنچا تھا) کے تتبع میں اردو غزل فارسی غزلوں کی طرح ردیف و قافیہ سمیت لکھی جانے لگی یہ بات اگر صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے میں تذکرہ نویسوں نے کبھی کچھ شک ظاہر نہیں کیا ہو تو پھر اردو زبان دکن میں نہیں بلکہ دلی ہی میں وضع کی گئی تھی۔ مگر محققین ادب اردو نے یہ امر صاف طور سے نہیں واضح کیا کہ شاہ ابوالمعالی کے ساتھ دہلی آنے سے پہلے ولی کس رنگ میں شعر کہا کرتا تھا۔ غالباً اس کا جواب یہی

ہوسکتا ہے کہ وہ اور دکنی شعرا مثلاً سلطان قطب شاہ وغیرہ کے انداز میں غزل کہا کرتا تھا۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ سلطان موصوف کی زبان زیادہ تر اہل پنجاب کی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ پس ولی کو یہ خاص فخر حاصل ہوا کہ اس نے اول مرتبہ دکنی یا پنجابی طرز سخن کو ترک کر دیا۔ پھر شعرائے فارسی کا طریق اختیار کیا تاہم ولی کے دیوان میں بھی دستا۔ انجھو۔ خوش قدان۔ جگ۔ پاکباز اں۔ اکھیاں۔ بھواں اور نین وغیرہ ایسے الفاظ بکثرت مستعمل ہوئے ہیں۔ جو شعرائے پنجاب کے کلام بھی عموماً پائے جاتے ہیں۔ ہاں ولی کے بعد جب اور زیادہ ہندی کی چندی ہوئی۔ اور پنجابی الفاظ قطعاً مسترد کر دئے گئے۔ تو شاہ حاتم۔ میر درد۔ سودا۔ اور میر تقی وغیرہ نے وہ خالص اردو لکھا۔ کہ جس پر موجودہ اردوئے معلےٰ کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔

اقتباسات شمس ولی اللہ - ولی

چونکہ یہ تذکرہ غزلگوئی کے بالکل خلاف ہے۔ اور خلاف رائے جمہورہ اخلاقی و قومی اشعار کو ہر شاعر کی شاعرانہ قابلیت کا معیار ٹھہراتا ہے۔ ہم ولی کی بعض ایسی مسلسل نظمیں یہاں درج کرتے ہیں۔ جو حقیقتاً اس وقت کے لحاظ سے بالکل بینظیر و بے مثال ہیں۔ مثلاً اس کا ایک نعتیہ قطعہ ہے جو آجکل کے نعت خواں حضرات کے لئے باعثِ دلچسپی ہوگا ۔

لامکاں پر بنا احمد جو بنا بٹھلایا | تب ملائک نے وہیں صلو علیکم گایا
حور و غلماں نے ترانے سے وہ نغمہ بجلے | قاب قوسین کا نوشہ تو ہی سب کو بھایا
تھے براتی وہاں آدم سے لگا تا احمد | اور جبریل امیں گوندہ کے سہرا لایا
حق نے لولاک لما حق میں محمد کے کہا | ان سوا کونسے مرسل نے یہ رتبہ پایا

معفرت تیری ولی سہل بلا ریب ہے کیوں
نام احمد کا جو لب پہ ترے ہر دم آیا

ایک قصیدہ میں یوں دنیائے دنی کی مذمت کی ہے ؎

گل دنیا کو زیب تاج نہ کر | یہ ہے سر پاؤں لگ محیل و دغل

اس سوں ہرگز نہ باندھ جی اپنا — کہ مبادا ہو دین بیچ خلل
ایک گھر میں رہے نہ بخلی یہ — طالب و یار مارہے یہ چنچل
اہل دانش نہ جائیں اسکے نزیک — طالب اسکے نہیں ہیں غیر اجہل
پُر کدورت ہی ہے پاؤں لگ — گرچہ ظاہر ہے صورت نربل
یہ کسی سوں وفا نہ کی ہرگز — بے وفا ہے مدام یہ کم بل
مثل قاروں نہ باندھ مال سوں دل — تب زمیں زندگی کوں جائے نگل
اس کی صحبت میں اے خستہ خصال — کچھ نہیں ہے بغیر درد و کسل
یہ ہے بالعرض طامعاں و حریص — اکثر اں دیکھ کر گئے ہیں پھسل

ترک کر اس کو بات میری سُن
حرف شیریں ہے یہ ز شیر و عسل

یہ کس قدر سادہ زبان ہے۔ جو ایک مدحیہ قصیدے کا ٹکڑا ہے ہم اوپر سلطان قطب شاہ کے قصیدے کا بھی ایک حصہ درج کر چکے ہیں۔ اس سے مقابلہ کر کے دیکھو۔ ولی کی زبان اہل فارس کی زبان کا نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ پس یہیں سے اُردو نے وہ رنگ

بدلا۔ کہ جس سے پنجابی۔ پنجابی ہی رہی اور اُردوئے قدیم۔ جدید اُردو و زبان بنگئی۔ ولی کی یہ مثنوی شہر سورت پر زبانِ اُردو کی اولین مثنوی ہے:-

عجب شہروں میں ہے پر نور اک شہر ‏ ‏ ‏ بلاشک ہے وہ سورت مقصدِ دہر
ہے مشہور اس کا ہر جا نام سورت ‏ ‏ ‏ کہ جاوے اس کے دیکھے سے کدورت
جہاں کی چشم کا گویا ہے وہ نور ‏ ‏ ‏ رہے اس نور سے جم چشم بد دور
شہر جوں منتخب دیوان ہے سب ‏ ‏ ‏ ملائک کا وہ گویا کان ہے سب
کنارے اس کے ہے دریائے تپتی ‏ ‏ ‏ کہ دُنیا دیکھنے کو جس کے جپتی
شہر سے ہے وہ ہم بازو ہمیشہ ‏ ‏ ‏ ہے دریا سے وہ ہم پہلو ہمیشہ
کہ خضرِ آب سے ہے اس کی تاثیر ‏ ‏ ‏ ہوا دیتی ہے اس کی یاد کشمیر

عجب قلعہ وہاں کا خوش قرینہ ‏ ‏ ‏ انگوٹھی میں ہے دُنیا کے نگینہ
قریب قلعہ نادر گھاٹ ہے واں ‏ ‏ ‏ کہ دائم گلرخاں کا ٹھاٹ ہے واں
کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گل ‏ ‏ ‏ وہاں ہر ایک کنے رخشاں ہے سنبل

ہے سورت وہ حقیقت کی نشانی ‏ ‏ ‏ کہ ہیں معمور واں اہلِ معانی
ہیں کتنے مردمانِ شام و تبریز ‏ ‏ ‏ نہ دیکھا کوئی ایسا ملک زرخیز

اور اس میں ہیں کتنے ایسے ہی تجار
کہ ناداں کا نہیں مطلق وہاں بار

اور اک آتش پرستوں کی ہے بستی
ہے نمرودی خجل آتش پرستی

دگر ان میں فرنگی بے عدد ہیں
کہ قول و فعل میں مکروہ و بد ہیں

وہاں ساکن ہیں اتنے اہل مذہب
کہ گننے میں نہ آویں انکے مذہب

شہر بہیتر جب آوے نہان کا دن
ہندو کی قوم کے اشنان کا دن

ہر اک جانب سے دیکھو فوج در فوج
سمندر کی تجلی کی اٹھی موج ،

جعفر زٹلی

میر جعفر زٹلی کی نسبت مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ کوئی ان کے کلام کو محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانے کا نمونہ کہتا۔ مگر زٹل کا اعتبار کیا؟ یہ بات صحیح ہے۔ لیکن نظم میں بوجہ وزن قافیہ اور ردیف کے تغیّر و تبدّل اکثر بہت کم کیا جا سکتا ہے۔ لہذا جعفر زٹلی کی زبان کے کچھ نمونے یہاں ہم بطور تفریح طبع نقل کرتے ہیں۔ ان کی زبان بھی صاف اور سلیس ہے۔ اور اس وقت کی نظم سے خوب لگا کھاتی ہے۔

در بیانِ قناعت

دلا در مفلسی سب سے اکڑ رہ | بعالم بیکسی سب سے اکڑ رہ
چکن اور زر کا چیرہ پشم کر بوجھ | پھٹی پگ[1] باندھ کر سب سے اکڑ رہ
نکر خواہش تو جامہ بافتی کی | کہن و گلا پہن سب سے اکڑ رہ
نہیں شلوار گر تیری تو کیا غم | لنگوٹا کھینچ کر سب سے اکڑ رہ
جو کچھ بھی ہاتھ لگ جائے چھپا کر | خوشی ہو ڈنڈ کر سب سے اکڑ رہ
اگر یہ بھی میسر ہو نہ تجھکو | اکیلا جوں الف سب سے اکڑ رہ

دستور العمل

ہر زن کہ باشد جنگجو - درچال مٹکے مو بمو
دارد بشوہر گفتگو اس نار سے انگار بہ
جورو لٹاکا گر بود - پُر خوف و ڈر آں گھر بود
آں گھر سدا ابتر بود اس گھر سے گنگا پار بہ

[1] پگ پنجابی زبان میں پگڑی

جو استری ٹل ٹل ہنسے ہر بات میں کھل کھل ہنسے
ہر ایک سے مل مل ہنسے بے مصلحت۔ بگذار بہ
جو ناریچکے چال میں سسکی بھرے ہر حال میں
کالا تو ہے کچھ دال میں از قرب او زنہار بہ

گھوڑا جو اسواری نہ دے صاحب طلب یاری نہ دے
بیٹا جو وہ یاری نہ دے ایں ہر سہ تن فی النار بہ
جو آشنا وعدہ کرے، وعدے سے پھر جھوٹا ٹھے
للوپتو پر من دھرے، از ہمچو کس بیزار بہ
جھوٹا خدا سے دُور ہے ایمان سے مہجور ہے
وعدہ کرے سو زُور ہے از مکر او ہشیار بہ
لنگوٹیہ جو یار ہو، ہمزاد کا سا پیار ہو
دولت بڑی عیار ہو، بر روئے او بیزار بہ
ضامن نہ ہوجے باپ کا ہے ضامنی گھر پاپ کا
اس سے بھلا دکھ پاپ کا زیں قول و فعل انکار بہ

شہر آشوب

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے ۔۔۔ ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیاں میں وفاداری ۔۔۔ محبت اُٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی ۔۔۔ اُتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے

دغل کرتے پھریں دغلے چغل کرتے پھریں چغلے ۔۔۔ شغل کرتے پھریں شغلے عجب یہ دور آیا ہے

ہنرمنداں ہرجائی پھریں در در بہ رسوائی ۔۔۔ رذل قوموں کی بن آئی عجب یہ دور آیا ہے

خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ پن گھر کی ۔۔۔ ملادیں بات سب بھر کی عجب یہ دور آیا ہے

نفر کی جب طلب ہووے غریب عاجز کھڑا رووے ۔۔۔ میاں گھر میں پڑا سووے عجب یہ دور آیا ہے

سپاہی حق نہیں پاویں اُٹھ اُٹھ چوکیاں جاویں ۔۔۔ قرض بنیوں سے لے کھاویں عجب یہ دور آیا ہے

دیا کرتے رہو جانا بھلائی سنگ لے جانا
کہے جعفر پورکھ سیانا عجب یہ دور آیا ہے

غالباً ادب اُردو میں شعراء کی ہجووں یا لطایف و ظرایف وغیرہ کی بنیاد میر جعفر زٹلی کے کلام نے ڈالی ہوگی۔ کیونکہ اس سے پیشتر ظریفانہ

لٹریچر کا مواد اتنا موثر اور سلجھا ہوا کہیں نہیں دیکھا گیا۔ بہر حال آجکل کے پنچ اخبار جو کچھ بھی لکھتے ہیں ان میں ببر صاحب موصوف کے دو ایک فقرے یا الفاظ ضرور۔ اپنی جھلک دکھا جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا کلام اکثر فحش ہونے کے باعث یہاں زیادہ اقتباس کے قابل نہیں ہے۔ ورنہ مثالوں سے واضح کیا جاتا کہ اردو میں ظریفانہ نظم کی ابتدا جعفر زٹلی سے ہوئی۔

کلیاتِ دلمیر

یہ کتاب میاں مستور خاں دلمیر نے ۱۸۵۰ء میں تصنیف کر کے بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اور اس کو وہاں سے کچھ انعام بھی ملا تھا۔ سنا ہے کہ ذوق اور غالب نے جب میاں دلمیر کے اشعار پڑھے۔ تو بادشاہ نے ان کو اس نمونہ پر کچھ کہنے کی فرمائش کی۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ہم اس شاعر کے کلام کو ولی دکنی حامد پنجابی اور جعفر زٹلی نارنولی کے اشعار کے بعد بلا لحاظ قید زمانہ اس لئے یہاں درج کرتے ہیں کہ اس میں وہی زبان برتی گئی ہے۔ جس کو آغاز اردو میں شعرا نے استعمال کیا تھا۔ اہل سائنس کا یہ عام دستور

ہے کہ وہ نسل انسان کی نہایت ہی قدیم۔ ابتدائی باتوں کو آجکل کی
غیر مہذب اور جاہل اجہل قوموں کے رویہ سے ثابت کیا کرتے ہیں۔
اسی طرح وہ زبان کہ جس کی نسبت اُردو کے اہلِ زبان کا یہ خیال ہو۔
کہ وہ پنجابی ہے یا بگڑی ہوئی اُردو ہے اور وہ آج کسی غیر مہذب
علاقے میں بولی جاتی ہو خوب سمجھ لو۔ کہ وہی زبان اردو کی پہلی شکل و
صورت ہے چنانچہ کلیاتِ دلمیر کے متعلق مولانا حالی نے رسالہ معارف
دسمبر ۱۹۰۱ء میں ایک مضمون شائع کروایا تھا۔ جواب مضامینِ حالی
میں بھی نقل کیا جا چکا ہے۔ کہ دلمیر کی زبان ایک بگڑی ہوئی اُردو ہے
کیونکہ اس کی کوئی بات حال کے شعرا کے طور و طریق کے مطابق نہیں ہے
لیکن مولانا حالی کو اس جگہ سخت دھوکہ واقع ہوا ہے۔ یہ دلمیر زمانہ حال
کے اُردو سے بخوبی واقف تھا۔ مگر اس نے قصداً ایسے لوگوں کی زبان
میں شعر کہا ہے۔ کہ جن کو فارسی یا اہل زبان کے مستعار تکلفات نہیں
چھوگئے۔ اور وہ تا ہنوز اسی زبان میں بات چیت کیا کرتے ہیں کہ جو
ابتدائے اُردو کے زمانے میں صوبہ پنجاب سے لیکر دکن تک بولی
جاتی تھی یہی اردو کی حقیقی اور اصلی صورت ہے۔ جو کسی قدر پنجابی سے

بلتی جُلتی ہے۔ اس لئے ہم اس بیاض میں ترقی زبان کے نمونوں کی ذیل میں بہت خوشی سے اس کو درج کرتے ہیں۔ زبان پنجابی یا قدیم ہندی میں زبان کو جیب یا جیبھ کہا جاتا ہے۔ اس پر دلگیر کا ایک قطعہ ہے۔ ؎

منہ میں بان چلاوے جیب | سگری آپھت ڈھاوے جیب
یا جیبھا کے سگرے کھوٹ | بھتیوں راڑ[۱] کراوے جیب
کدہیں تو بولے امرت بول | کدہیں بکھ کھنڈاوے جیب
پٹ سوں بول او پاد کے بول | تُرت کھرت لک جاوے جیب
جیبھا کاہ تنک سی جونک | لوہو مانس کھاوے جیب
دھرتی پاکرے لکھوں بگاڑ | انبر آگ لگاوے جیب
یوہے گیرے نرکھوں کُنڈ | یوہے سرگ کماوے جیب

تُوں دلگیر جیبھا کے بس
تیری کوئی گھٹاوے جیب

ایک اور مسلسل نظم میں روپیہ پیسہ کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے ؎

[۱] فساد

بنا روپیوں اُجڑے گاؤں ‌‌ ‌ ‌ بنا روپیوں اُرجائے ناؤں
بنا روپیوں دُھوپ نہ چھاؤں ‌ ‌ ‌ ‌ بنا روپیوں ٹھور نہ ٹھاؤں

بہن کوئی نہ بھیّا ہے

سب کا رام روپیہ ہے

نظیر اکبر آبادی

زندگانی بے نظیر یا سوانحمری نظیر کے عنوان سے سیّد عبدالغفور صاحب شہباز نے ایک ضخیم بیوگرفی اس عجیب و غریب شاعر کی تالیف کی ہے جس میں نظیر کی زبان پر جسقدر اعتراضات اساتذہ کی طرف سے وارد ہوتے ہیں ان کا مفصل و مدلل جواب دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نظیر کو کہیں برن سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح اس انگریزی شاعر نے زبانِ انگریزی کو خاص الفاظ اور محاورات دیتے ہیں۔ اسی طرح نظیر نے زبان اُردو کو دیتے ہیں۔" کہیں نظیر کو شیخ سعدی اور شیکسپیر کے مثل ایک ہمہ گو

شاعر ثابت کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس نے اُردو اور ہندی کے جتنے الفاظ اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں اُردو زبان کا کوئی شاعر اتنے الفاظ ہرگز اپنی کسی تصنیف میں استعمال نہیں کر سکا غرض نظیر فی الواقع ایک بے نظیر ادیب تھا۔ اس کے بعض اشعار سوز و گداز اور لطیف زبان میں میر تقی کے شعروں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کی زمانہ گذشتہ یعنی غزلگوئی کے زمانہ میں شعرا نے کچھ قدر نہیں کی لیکن اب نیچرل شاعری اور ملکی مذاق کے لٹریچر نے نظیر کو ایک مسلم الثبوت شاعر منوا دیا ہے۔ لہٰذا ہم اس کو اس خیال سے کہ اس کی زبان ہندی و پنجابی سے زیادہ تر متماثل اور میر تقی و سودا کے کلام سے کچھ پرانی معلوم ہوتی ہے۔ اس کو میر کے بعد اس بیاض میں جگہ دیتے ہیں۔

نظیر میں ایک بڑا عیب یہ تھا کہ وہ بہت پُرگو تھا۔ اور چونکہ پُرگوئی میں شاعر کو یہ تمیز باقی نہیں رہتی کہ وہ سوقیانہ اشعار کو اپنے اعلےٰ اعلےٰ اشعار سے جداگانہ رکھ سکے۔ اس سے زبان مخلوط ہو کر اس شاعر کا تمام کلام ہی مذموم خیال کیا جاتا ہے مثلاً مرزا غالب

کا پورا دیوان جو حال میں نسخہ حمیدیہ کے نام سے بھوپال میں شائع ہوا ہے۔ اگر اس کو غور سے پڑھا جائے تو اس میں اعلےٰ اعلےٰ خیال کے اشعار محض سوقیانہ اشعار کے ساتھ ملکر غالب کو غالب نہیں رہنے دیتے۔ بلکہ ایسے کلام کا نام مہملات غالب مناسب رکھا گیا ہے۔ ایسے ہی اگر نظیر اپنے کلام کا صرف انتخاب شائع کر دیتا تو اس کی شاعری پر ہرگز کوئی حرف نہ رکھتا۔ تاہم نیچرل گو شعرا میں وہ سب سے پیش پیش ہے۔ علاوہ ازیں فرسودگی زبان کے اعتبار سے بھی ہم اس کے کلام کا ایک اقتباس میر و مرزا کے انتخابات سے بہت پہلے یہاں درج کرتے ہیں۔ تاکہ زبانِ اردو نے جیسے جیسے اپنا رنگ بدلا ہے۔ علم اس سے کہ کون شاعر پہلے پیدا ہوا اور کون پیچھے۔ سلسلہ وار ترقی زبان کا فوٹو ہمارے ذہن میں محفوظ ہو جائے۔

کلام نظیر

تندرستی ہزار نعمت ہے

یہ تندرستی یارو بڑی بادشاہی ہے
سچ پوچھیے تو عین یہ فضلِ الٰہی ہے

دولت سے گر کسی کا بھرا ہے تمام گھر
بیمار ہو تو خاک سے بدتر ہے سب زر

پروا نہیں اگرچہ لکھا یا پڑھا نہ ہو
محتاج حق سوا یہ کسی اور کا نہ ہو
حسن و جمال و علم و ہنر گو ملا نہ ہو
اک تندرستی چاہیئے کچھ ہووے یا نہ ہو

دنیا میں اب انھوں کے تئیں کہیے بادشاہ
جن کے بدن درست ہیں دن رات سال و ماہ
جن پاس تندرستی و حرمت کی ہو سپاہ
ایسی پھر اور کونسی دولت ہے واہ واہ
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

قدرت سے یہ جو تن کی بنی ہے ہر ایک کل
جب تک یہ کل بنی ہے جبھی تک پڑے ہے کل
گر ہو خدا نخواستہ اک کل بھی چل بے چل
پھر نہ خوشی نہ عیش نہ کچھ زندگی کا پھل
اس میں تمام ختم ہیں عالم کی خوبیاں
ہوں تندرست اور ملے عزت کے آب و ناں

عاجز ہوں یا فقیر ہوں پر تندرست ہوں
مفلس ہوں یا حقیر ہوں پر تندرست ہوں

بے زر ہوں یا اسیر ہوں پر تندرست ہوں — قیدی ہوں یا اسیر ہوں پر تندرست ہوں
گر اپنے گھر میں میری دحشمت پناہی ہے — بن تندرستی سب وہ خرابی تباہی ہے
بیمار کچھ بھی ہووے اگر کوئی بادشاہ — تم اس کو جانو بس وہ گدا سے بھی ہے تباہ
ہم تو اسی کو شاہ کہیں اور جہاں پناہ — اب جس کا تن درست ہو حرمت سے ہو نباہ
ادنیٰ ہو یا غریب تونگر ہو یا حقیر — ہو بادشاہ شہر کا یا ملک کا وزیر
ہے سب کو تندرستی و حرمت ہی دلپذیر — جو تو نے اب کہا سو یہی سچ ہے اے نظیر

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اس نظم میں کچھ تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔ یعنی ایک مسلسل مسدس کے بجائے اس کو دو قطعوں میں تقسیم کر دینے سے گو نظم کچھ مختصر سی ہو گئی ہے۔ مگر اس کی دلچسپی میں ہرگز کچھ کمی واقع نہیں ہوئی اگر نظیر کی اکثر نظمیں اسی طرح قدرے اصلاح کے ساتھ خلاصہ کر لی جائیں۔ تو مناظر قدرت و جذبات ملت وغیرہ کے سینکڑوں اچھے اچھے نمونے اردو جدید کے مطابق ہمیں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اور موجودہ ذخیرہ اخلاقی اشعار میں توسیع ہو سکتی ہے ——

موسم برسات مخمس

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں | سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ قطرات کی بہاریں | ہر بات کا مزہ اور ہر گھات کی بہاریں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں | جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں | گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں | گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں | اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے | قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو گئے ہیں پیدا ہرے بچھونے | بچھوا دیے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں پہ بیر بہوٹی ٹیلوں اوپر دھتورے | پسّوے مچھروں سے روئے کوئی بسورے

آنگن ہر کنسلائی کونوں ہیں کن کھجورے | بچھو کسی کو کاٹے کیڑا کسی کو گھورے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بیٹھے ہیں کتنے خوش ہو اونچے چھوا کے بنگلے | پیتے ہیں مے کے پیالے اور دیکھتے ہیں جنگلے
کتنے پھریں ہیں باہر خوبوں کو اپنے سنگ لے | سب شاد ہو رہے ہیں زردار یا کہ کنگلے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں نے اپنی غم میں ہے اب یہ گت بنائی | میلے کچیلے کپڑے آنکھیں ہیں ڈبڈبائی
نے گھر میں جھولا ڈالے نہ اوڑھنی رنگائی | ٹوٹا پڑا ہے چولہا سونی پڑی کڑھائی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو بھنگ پی کر بیٹھے بھگو رہے ہیں | باہیں گلوں میں ڈالے جھولوں میں سو رہے ہیں
کتنے برہ کے مارے سدھ اپنی کھو رہے ہیں | جھولے کی دیکھ صورت ہر آن رو رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

چھت گرنے کا کسی جا غل شور ہو رہا ہے | دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
در در حویلی دالاہر آن رو رہا ہے | مفلس سو جھونپڑے میں دلشاد سو رہا ہے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے شراب پی کر ہو مست جھک رہے ہیں | پڑتا ہے مینہ جھڑا جھڑ طبلے کھڑک رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گر کر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر | پھسلا کوئی کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر | ہوتے ہیں سینکڑوں کے سر نیچے پاؤں اوپر

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہ رُت وہ ہے کہ جس میں خرد و کبیر خوش ہیں | ادنیٰ غریب و مفلس شاہ و وزیر خوش ہیں
سب لڑکے بالے بڈھے طفل اور پیر خوش ہیں | جتنے ہیں اب جہاں میں سب اے نظیر خوش ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ایک حسین عورت سے خطاب

لے آئینہ کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ | صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ
خال سیاہ اور خطِ مشکبار دیکھ | زلف دراز طرہ عنبر نثار دیکھ

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے جان ترا ایک صاف دل | اور خال کیا ہیں تیرے سویدائے رُخ کے تل
زلف دراز فہمِ رسا سے رہی ہے مل | لاکھوں طرح کے رنج ہی میں ہم رہے ہیں کھل

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشک تتارِ و مشک ختن بھی تجھی میں ہے ۔ یاقوت سرخ لعل یمن بھی تجھی میں ہے
نسرین موتیا یاسمن بھی تجھی میں ہے ۔ القصہ کیا کہوں چمن بھی تجھی میں ہے

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

سورج بھی گے گل کی اگر دل میں تاب ہے ۔ تو اپنے منہ کو دیکھ کہ خود آفتاب ہے
گل اور گلاب کا بھی تجھی میں حساب ہے ۔ رخسار تیرا گل ہے پسینہ گلاب ہے

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نرگس کے پھول پر تو نہ اپنا گمان کر ۔ اور سرو سے بھی دل نہ لگا اپنا جان کر
اپنے سوا کسی پہ نہ ہرگز تو دھیان کر ۔ یہ سب سمائے ہیں تجھی میں تو آن کر

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نرگس وہ کیا ہے جان ترے چشم خوش نگاہ ۔ اور سرو کیا ہے یہ ترا قدِ دراز آہ

گر سبزِ باغ چاہیے تو اپنی کر تو چاہ | حق نے تجھی کو باغ بنایا ہے واہ واہ

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

گر دل میں تیرے قمری و بلبل کا دھیان ہے | تو ہونٹ تیرے قمری ہیں بلبل زبان ہے
ہے تو ہی باغ اور تو ہی باغبان ہے | باغ و چمن ہیں جتنے تو ان سب کی جان ہے

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

بیلا گلاب سیوتی نسرین و نسترن | داؤدی جوہی لالہ و رابیل یاسمن
جتنے جہاں میں پھولے ہیں پھولوں کے انجمن | یہ سب تجھی میں پھول رہے ہیں چمن چمن

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

باغ و چمن کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر | قمری کی سن صدا کو نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیا ہے ارے نظیر | ہیں لفظ من عرف کے یہی معنی اے نظیر

ہر لحظہ اپنی چشم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

بنجارہ نامہ

اب حرص ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا کوئی پلّا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

گر تو ہے لکھّی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقے سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلے گا بنجارہ

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھّم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاویگا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا

دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آویگا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

ہر منزل میں یہ ساتھ تیرے یہ جتنا ڈیرا ڈنڈا ہے
زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب ناٹک نکل تن سے گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تیری ڈھل جاویگی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھانس نہ چرنے آویگی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاویگی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آویگی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارہ

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی

کیا برتن سونے چاندی کے کیا مٹی ہنڈیا چینی کی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لئے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل
اک تنکا ساتھ نہ جاویگا موقوف ہوا جب ان اور جل
گھر بار اٹاری چوباری کیا خاصہ نین سکھ اور ململ
کیا چلون پردے فرش نئے کیا لال پلنگ اور رنگ محل
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

کچھ کام نہ آویگا تیرے یہ لعل و زمرد سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھریگی ہر آن بنیگی جان اوپر
نوبت نقارے بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکان کیا چوکی کرسی تخت چھتر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے

کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لعل عماری کے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت بھول بھروسے ڈھالوں کے

سب ٹپا توڑ کے بھاگینگے مُنہ دیکھ اجل کے بھالوں کے

کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے

کیا بغچے تاج مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

کیا سخت مکاں بنواتا ہے کھم تیرے تن کا ہے پولا

تو اُونچے کوٹ اُٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا

کیا رینی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا

گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکیگا

کوئی ناج سمیٹیگا تیرا کوئی گون سے اور سلانے کا

ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کو پھانکے گا

اس جنگل میں پھر آہ نظیرؔ اک تنکا آن نہ جھانکیگا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلیگا بنجارا

ولی محمد نظیر تمام عمر مکتب پڑھایا کئے۔ کہتے ہیں مرزا غالب بھی ان سے مکتب میں پڑھے تھے۔ ان کا اصلی وطن دہلی تھا نہ کہ آگرہ جہاں صرف تباہیٔ دلّی کے بعد آرہے تھے۔ شاہ اودھ نے معقول مشاہرہ پر لکھنؤ بلوایا تھا۔ مگر حدود آگرہ سے باہر نہ نکلے۔ ۱۶۔ اگست ۱۸۳۰ء کو وفات پائی۔

خواجہ میر درد

سال وفات ۱۷۸۵ء

(کمالِ سخنوری)

تصوف میں ان کا کلام لاجواب ہے۔ باوجودیکہ ان کا دیوانِ اشعار اس قدر مختصر ہے کہ اور کسی اُردو گو شاعر کا دیوان اتنا چھوٹا نہ ہوگا۔ مگر میر اور سودا کے بعد انہی کے کمال شاعری کا سب تذکرں

میں اعتراف کیا گیا ہے۔ شعرا کو ان کی کم گوئی سے یہ سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ کہ دنیائے شاعری میں ہمیشہ حسن کلام کی قدر ہوتی ہے۔ نہ کہ ایک بھاری بھرکم ضخیم کلیات کی۔ جو اصولاً کوئی شاعر تصنیف نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک غزل میں وہ اشعار جو ناخن بر جگر ہوں معدودے چند سے زیادہ کبھی نہیں ہوا کرتے۔

اُن کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محض جوانی اور تشنۂ سخن کے عالم میں شعر و شاعری سے اپنی طبیعت بہلایا کرتے تھے کیونکہ جب ولی بگڑی اور بڑھاپا بھی قریب ہوا۔ تو انہوں نے شعر گوئی سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ چنانچہ اپنے دیوان فارسی میں اس امر کے متعلق ایک رباعی لکھی ہے ؎

در موسمِ پیری کہ سفر در وطن است
ہر روز جواب طاقت جان و تن است
زیں پیش بصد رنگ سخن میگفتم
اکنوں اے درد در خموشی سخن است

دیوان درد کی قلیل ضخامت اور اس میں قصیدہ اور مثنوی کی (جو عموماً شعرا کے کمال فن پر دال ہیں) عدم موجودگی کے سبب آزاد نے آبحیات میں لکھا تھا۔ کہ میر صاحب نے انہیں آدھا شاعر

مانا ہے۔ مگر میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعرا اب انجمن ترقی اُردو نے
چھاپا، تو معلوم ہُوا۔ کہ حضرت آزاد کی یہ راتے بالکل مصنوعی تھی۔
اور غالباً اُسی سبب سے جو اوپر درج ہُوا ہے[1]۔ تراشی گئی تھی۔۔۔
۔۔۔ موجودہ شعرا کو میر درد کی کم گوئی شعر کہتے وقت ہمیشہ مدِ نظر رکھنی
چاہئے۔ ایک انگریز مبصر نے اپنے تذکرہ میں لکھا تھا کہ زمانہ قدیم
کا سب سے بڑا شاعر میر درد ہی ہے کیونکہ فنِ شاعری کا کمال کم گوئی
ہے۔ نہ کہ پُرگوئی۔

غزلیں تو اس بیاض میں انتخاب ہی نہیں کی گئی۔ اس لئے میر درد
کی کچھ اعلیٰ فارسی کی رباعیاں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

حرص و ہوا

پیدا کرے ہر چند تقدس بندہ | مشکل ہے کہ حرص سے ہو دل برکندہ
جنت میں بھی اکل و شرب سے نہیں ہے نجات | دوزخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندہ

افسردگی

اے درد یہ درد جی کا کھونا معلوم | جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم

[1] یعنی دیوان درد قلمی ضخامت

گلزارِ جہاں ہزار پھولے لیکن | میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

یہ رباعی غالباً شاہ حاتم کی اس رباعی کے جواب میں لکھی گئی ہے جو نیچے درج ہوتی ہے

ان سیمبروں کے ساتھ سونا معلوم | قسمت میں لکھی ہے خاک سونا معلوم
حاتم افسوس دے وا امروز گذشت | فردا کی رہی امید سونا معلوم

قناعت

بے لشکر و فوج پادشاہی کردیم | بر مسند فقر کبریائی کردیم
اے درد بدولت فقیری اینجا | در کسوت بندگی خدائی کردیم

اسی مضمون میں مولانا حالی کی یہ رباعی[1] لاجواب ہے

دولت کی ہوس اصل گدائی یہ ہے | سلطاں کی حرص بے نوائی یہ ہے
حاجت کم ہے تو ہے یہ شاہنشاہی | اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی یہ ہے

حیاتِ انسانی

از فکر معاش گہ پریشان شدہ | گاہ ز غم معاد حیران شدہ
ایں ہر دو باختیار تو نیست ولے | مشکل ہمہ این است کہ انسان شدہ

[1] بحوالہ جواہرات حالی

ولہ

اے بیخود غفلت بچہ فرزانہ شوی
با چشم پر آب ہمچو پیمانہ شوی
امروز بہ افسانہ ترا خواب آید
فردا است کہ میخوابی و افسانہ شوی

دِلّی جب بگڑ گئی اور میرؔ و سوداؔ - مصحفیؔ و جراتؔ وغیرہ سب شعرا گھبرا کر لکھنؤ چلے گئے۔ تو میر دردؔ کے پائے ثبات کو ہرگز لغزش نہیں آئی۔ دِلّی ہی میں اطمینان سے بیٹھے رہے۔ اس کے متعلق یہ دو فارسی رباعیاں ہیں ؎

دِلّی کہ خراب کرد اکنوں دہر شش
جاری شدہ اشکہا بجائے نہرش
بود است ایں شہر مثل روئے خوباں
چوں خط بتاں بود سواد شہرش

ایضاً

گو خلق پر از شور و شر و غوغا باش
تو از ہمہ کس یکطرف و تنہا باش
بر صورت بے معنی عالم نگرد
بر معنی بے صورت حق شیدا باش

بے ثباتی دنیا

گاہے سحر است و گاہ شام است اینجا
از کون و فساد انتظام است اینجا
مانند شرر مشو ز ہستی غافل
یک چشم زدن کار تمام است اینجا

میر تقی میر۔ وفات ۱۸۱۰ء

میر صاحب کا کمال فن یہ ہے۔ کہ ان کی چھوٹی بحر کی غزلیں اُردو زبان کے ستّر اور دو بہتّر نشتر ہیں۔ اس لئے کلام میر کا مطالعہ ہر شاعر پر فرض سمجھا گیا ہے۔ بلکہ میر صاحب ہی اُردو کے وہ خوش نصیب شاعر ہیں۔ کہ جن کے کمال سخنوری پر ذوق۔ غالب۔ سودا اور ناسخ وغیرہ سب اکابر شعرا نے متفقہ طور پر صاد کیا ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے ان کے کلیات کا ایک خلاصہ اور ان کا تذکرہ نکات الشعرا شائع کر دیا ہے۔ لہذا میر صاحب کی نسبت یہاں تفصیل کے ساتھ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میر صاحب کی غزلیات میں جو عجیبات پایا جاتا ہے اس کی مختصر سی تشریح سطور ذیل میں درج کیجاتی ہے۔ غزل ؎

لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا | کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

اسی مضمون پر ذوق کا ایک شعر ہے ؎

مرے جو موت کے عاشق بیاں کبھی کرتے | مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

میر کے شعر میں جانوں کا کھپا جانا۔ اور موت کے مرنے ایسے

سوقیانہ الفاظ کے عوض لذت سے خالی نہ ہونا۔ یہ ایسے موثر فقرے ہیں کہ جس شعر میں استعمال کئے جائیں وہ شعر کہنے والے کو ایک با سلیقہ شاعر بنا دیتا ہے۔ اسی غزل کے دو اور شعر ہیں ؎

یہ بھی ہے ادا کوئی خورشید نمط پیارے
منہ صبح دکھا جانا پھر شام چھپا جانا

اس کا دوسرا مصرعہ جو صنعت شاعرانہ سے خالی نہیں ہے۔ از روئے فطرت بھی بالکل صحیح ہے۔ کہ سورج صبح کو منہ دکھاتا ہے اور شام کو چھپ جاتا ہے۔ پس میر تقی نے محاورات زبان کے ساتھ جو فطرتی خیالات نہایت سادہ طور پر نظم کر دیتے ہیں۔ وہی اردو میں ستر دو بہتر نشتر بن گئے ہیں۔ علیٰ ہذا یہ شعر ؎

اے شور قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں
اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

باوجود شور و غل ہونے کے کسی کا سوتا رہ جانا ہمیشہ دوسروں کے لئے ایک وجہ استعجاب و مسرت ہوا کرتا ہے۔ اور یہ ایک فطرتی بات ہے۔ میر صاحب نے اسی کو جب نظم کر دیا تو شور قیامت کا مضمون قیامت ہو گیا ؎

میر صاحب اپنے تذکرہ کے خاتمہ پر لکھتے ہیں۔ کہ زبان ریختہ یا اُردو ریختہ کی چند قسمیں ہیں۔ مثلاً اوّل ایک مصرعہ فارسی زبان کا دوسرا ہندی بکا جیسے خسرو کی یہ غزل ہے ؎

زرگر پسرے چو ماہ پارا | کچھ گھڑتے سنوارتے پکارا[۱]

الخ دوئم نصف مصرعہ فارسی نصف مصرعہ ہندی ہو۔ جیسے میر معز کی یہ غزل ؎

از زلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے

در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

سوم۔ حرف اور فعل فارسی لاتے جائیں۔ مثلاً مصرعہ

ہولی یا دیوالی میں محرم اگر آید

اور یہ طرز اب بالکل متروک ہے۔ (ہاں موئج اخبارات اس کو سلیقہ سے برت سکتے ہیں) چہارم فارسی زبان کی بعض مناسب ترکیبات جو زبانِ اُردو کے محاورہ اور روزمرہ کے موافق ہوں۔ اُن کو شعر میں کھپایا جائے۔ مثلاً تر آمدن شرمندہ ہونا ایک فارسی زبان کا محاورہ ہے اس کو میر صاحب اُردو میں یوں باندھتے ہیں ؎

[۱] ملاحظہ ہو تذکرہ نکات الشعرا۔

کھلنے میں ترے منہ کی کلی پھاڑے گریباں
آگے ترے رخسار کے گل برگ تر آوے

یعنی شرمندہ ہو جائے۔

نمود کرنا ایک روزمرہ فارسی تھا، میر صاحب کہتے ہیں سہ

نمود کر کے وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میر بھی اک بلبلہ تھا پانی کا

یہاں کہے تو بھی تو گوئی کا ترجمہ ہے۔ جواب متروک ہے۔

اس قسم کے ریختہ کی نسبت میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مختار فقیر ہمین است۔ یعنی میر صاحب کے کلام کا ایک خاص جوہر بعض فارسی تراکیب اور محاورات کا سلیقہ کے ساتھ اردو میں ترجمہ کرنا ہے۔ میری دانست میں میر صاحب نے جہاں جہاں ایسے تصرفات کر کے اردو کو توسیع دلائی ہے۔ اس پر ہر ایک اردو گو شاعر کو خاص طور سے توجہ کرنی چاہئے۔ مثلاً میر صاحب فرماتے ہیں

اچھا نہیں ہے میر کا احوال ان دنوں | غالب کہ ہو چکیگا یہ بیمار ان دنوں

ولہ

یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہو۔ گل میں رنگیں نہیں ہیں نقش پائے بلبل

ولہ

سر فرو لاتی نہیں ہمت ہی مری کے پاس۔ ہوں گدائے آستان میر حضرت شاہ کا

ولہ

کیسے کیسے مکان ہیں ستھرے | اک ازاں جملہ کربلا ہے یہاں

ان اشعار میں غالب کہ نقش پائے بلبل۔ سر فرو لانا اور از انجملہ وغیرہ ایسی فارسی ترکیبیں ہیں کہ ان کے سوائے مطلب میں جو جدت کے علاوہ فصاحت و بلاغت بھی بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی ہے لیکن یہی میر صاحب کی زبان کا وہ شکر ہے جو ایک غزل میں خود بخود کھپا جاتا ہے (کلیات میر تقی ذرا غور سے مطالعہ کرنے کے قابل ایسی ترکیبیں) جن سے شعر میں جان پڑ جائے۔ اب بھی اعلیٰ پایہ کی غزلوں میں ان کی ضرورت اسی طرح باقی ہے جیسے کہ قدیم غزل گوئی کے زمانے میں تھی اس لئے میر تقی کا کلام اس صنف غزل میں خاص طور پر ممتاز اور لطف زبان اٹھانے کے قابل ہے۔

پنجم ایہام ۔ یہ صنعت قدما میں بہت رائج تھی مگر اب اس کا رواج نہایت کم ہو گیا ہے **ششم** ۔ وہ انداز جو اکابر شعرا نے عموماً اختیار کر رکھا ہے اور ان میں میرؔ بھی شمول ہے ۔ یعنی تجنیس ۔ ترصیع تشبیہ معاملہ بندی ۔ صفائی گفتگو اور فصاحت و بلاغت وغیرہ کا التزام اپنے کلام میں مثلاً ؎

یہ جو چشم پُر آب ہیں دونوں ایک خانہ خراب ہیں دونوں

اس شعر میں ایک اور دو صنعت تجنیس کے خیال سے لائے گئے ہیں ۔ فرد ؎

وحید زمانہ ریاضت میں تھے ۔ جنید زمانہ عبادت میں تھے

یہاں مصرعہ اول و دوئم کے پہلے اور بعض بیچ کے الفاظ مثلاً وحید جنید ۔ ریاضت اور عبادت ہم قافیہ اور ہم وزن ہیں یہی صنعت ترصیع ہے (مگر کلیات میر میں ایسی صنعتیں خال خال نظر آتی ہیں) تشبیہ ۔ اگر نیچرل ہو جیسے کہ میر صاحب اکثر برت گئے ہیں تو شعر کو بہت چمکا دیتی ہے مثلاً

چار دیواری عناصر میرؔ خوب جا گہہ ہے پر ہے بے بنیاد

انسان کی ہستی کو چار عناصر فرض کر لیا گیا ہے پھر اس تشبیہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ چار دیواری بالکل بے بنیاد ہے۔

معاملہ بندی۔ اس فن میں میر صاحب اگرچہ جرأت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہاں بعض اشعار اچھے لکھے ہیں مثلاً ؎

جو کہو تم سو ہے بجا صاحب۔ ہم بُرے ہی سہی بھلا صاحب
سادہ ذہنی میں نکتہ چیں تھے تم۔ اب تو ہیں حرف آشنا صاحب
پھر گئیں آنکھیں تم نہ آن پھرے۔ دیکھا تم کو بھی واہ وا صاحب

صفائی گفتگو یعنی سلاستِ زبان۔ جو اوپر کے اشعار سے واضح ہے وہ میر صاحب کا خاص حصہ ہے۔ مثال فصاحت ؎

باہم سلوک تھا تو اُٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

اس شعر میں مبتدا اور خبر وغیرہ اسطرح مستعمل ہوئے ہیں گویا نثر کی نثر اور نظم کی نظم معلوم ہوتی ہے۔

مثال بلاغت ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم۔ اب ہوئے خاک انتہا ہے یہ

عشق کی ابتدا اور انتہا اس قدر جامعیت، نزاکتِ خیال اور مثال کے ساتھ بیان کی ہے کہ اگر صرف اسی کی تشریح کی جائے تو کئی صفحے سیاہ ہو جائیں

آبِ حیات میں میر صاحب کی بد دماغی کی نسبت بڑی شدّ و مدّ سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ مگر میر صاحب کے نکات الشعراء[1] یا گلشن ہند سے یہ عیب ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں آزاد[2] لکھتے ہیں کہ خود گورنر جنرل ہند نے میر صاحب سے ملاقات کی درخواست کی۔ مگر اس بنا پر انہوں نے مسترد کی کہ وہ میرا کلام سمجھتے نہیں۔ میرے علو خاندان سے کچھ ان کو واسطہ نہیں ہے البتہ کچھ انعام دینگے۔ ایسی ملاقات سے ذلّت کے سوا کیا حاصل۔ لیکن گورنر ہند تو کجا صاحب گلشن ہند کا بیان ہے کہ جن ایّام میں بہ خواہش صاحبان عالی شان کی زبان داناں ریختہ کے متعلق کلکتہ سے لکھنو گوئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو نوبت میر کی ہوئی۔ لیکن علّت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے یعنی ملازمت کے قابل نہ سمجھے گئے۔ ہم میر صاحب کی غزلوں اور قصیدوں وغیرہ کو تو یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔ مگر ان کی ایک مثنوی کا اقتباس اسلئے اس جگہ

[1] میر تقی کا تذکرہ نکات الشعراء (انجمن ترقی اردو) [2] بحوالہ آبِ حیات۔

درج کرتے ہیں۔ مولینا حالی کا عقیدہ ہے کہ جس زمانے میں میر نے اپنی عشقیہ مثنویاں مثلاً شعلۂ عشق اور خواب وخیال وغیرہ لکھی تھیں۔ اسوقت اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنا امکان سے خارج تھا۔ (بحوالہ مقدمہ شاعری) لہذا سطور ذیل میں ایک مثنوی جس میں جھوٹ کی شکایت ہے۔ میر صاحب کے کلام سے قلمبند ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ اُن کی دوسری مثنویوں سے ہرگز بہتر نہیں ہے۔ مگر کسی قدر اخلاقی اور سبق آموز ہے۔

مثنوی جھُوٹ کی مذمت

اے جھُوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھُوٹ تو شعار ہوا ساری خلق کا!
کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہلِ دلق کا
اے جھوٹ تجھ سے ایک خرابی ہیں شہر ہے
اے جھوٹ تو غضب ہے قیامت ہی قہر ہے

اَے جھوٹ رفتہ رفتہ ہوا یاں ترا رواج
تیری متاعِ باب ہے ہر چار سُو میں آج
اے جھوٹ کیا کہوں کہ بلا زیر سر ہے تو
اَے جھوٹ سچ یہ ہے کہ عجب فتنہ گر ہے تو
اَے جھوٹ کب ہے عرصے میں تجھ سا حریف اب
تیرے ہی حکم کش ہیں وضیع و شریف اب
اَے جھوٹ تیرے شہر میں ہیں تابعیں سبھی
مرجائے کیوں نہ کوئی و لے سچ بولے نے کبھی
کہنے سے آج ان کے کوئی دل نہ شاد ہو
فردا کہیں تو اس سے قیامت مراد ہو
وعدے گھڑی کے پہروں گے سب آزما چکے
برسوں تک انتظار کیا جی ہی جا چکے
اَے جھوٹ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں
رکھتا ہے جیسے غنچہ زباں تو تہِ زباں
(ق)
یوسف کہ تھانبی و سعادت شعار تھا

پھر حسنِ ظاہری سے وہ باغ و بہار تھا
پایانِ کار تیرے سبب چاک پیرہن
زنداں میں جا کے برسوں رہا چھوڑ کر وطن
اے جھوٹ تو تو ایک دلآویز ہے بلا
آشوب گاہ تجھ سے زمانہ سدا رہا
کس جانکنی سے کوہکنی کوہکن نے کی
تصویر خسرو و شیریں کے پیش نظر رکھی
نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب ہی ملے
اب صبح و شام غنچۂ مقصود دل کھلے
دلالہ کے تو پردے میں آ کام کر گیا
دو باتوں میں وہ عاشق دلخستہ مر گیا
اے جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اٹھا گئے
ہنگامہ و فساد بھی ہر سو رہا کیے
اے جھوٹ راستی سے نہیں گفتگو کہیں
کہنے کو ہاں کہیں ہیں حقیقت میں ہیں نہیں

اے جھوٹ اس طرح ہیں بہت جی سی جا چکے
وعدوں ہیں آہ لوگوں کے وعدے ہی آچکے

اے جھوٹ اس زمانہ میں کیونکر چلے معاش
ہے تنگ جھوٹ بولنے سے عرصہ تلاش

سردار[1] جس سے سب متعلق ہے کار و بار
سچ بولنا ہے اس کے تئیں سخت ننگ و عار

پھر سب مدار کار دروغی و مفتری
صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

مشکل حصول کام ہے یاں حاصل کلام
باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام

اے جھوٹ میرا دل بھی بہت دردناک ہے
ان کاذبوں سے صبح نمط جیب چاک ہے

[1] آجکل سردار میر خانساماں یا بہرہ وغیرہ کو کہتے ہیں۔ پہلے سردفتر یا سپہ سالار کہلاتا تھا۔

میرزا محمد رفیع سوداؔ

(سن ولادت ۱۷۸۱ء)

کمالِ سخنوری

اُردو زبان میں موجودہ غزل اور قصیدہ کی ابتدا ولی سے ہوئی۔ چنانچہ میر نے غزل میں کمال حاصل کیا۔ اور سودا نے قصیدہ میں مگر میرا عقیدہ ہے کہ سودا نے میر کی دردناک اور فصیح و شیریں الفاظ سے مملو غزلوں کے بالمقابل ایک بشاشت انگیز، پرشوکت اور کسی قدر گراں و وزنی الفاظ سے مرکب غزل کہنے کا دستور زبانِ اُردو میں نکالا تھا جیسے انگریزی میں ڈاکٹر جانسنؔ کے نام پر جانسونین سٹائل[1] کہتے ہیں۔ اس قسم کی غزل کی سودا سے ابتدا ہو کر مرزا غالب پر خاتمہ ہوا۔ لہذا مرزا سودا کو قصیدہ و غزل دونوں میں صاحب ایجاد کہہ سکتے ہیں۔ مرزا صاحب پہلے

---

[1] اردو نثر میں ڈاکٹر نذیر احمد کی طرزِ عبارت جانسونین سٹائل میں ہے۔

فارسی غزلیں کہا کرتے تھے۔ مگر خان آرزو نے ان کو سمجھا بجھا کر اردو کیطرف متوجہ کیا تھا۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ قابل سے قابل شعرا بھی بعض اوقات اپنے حسن قابلیت کو پہچان نہیں سکتے۔ لہذا اس امر میں بعض شعر فہم دوستوں سے مشورہ کر لینا نہایت ضروری ہے جیسے کہ سودا کے حال میں یہاں تحریر ہوا ہے۔

کلیات سودا میں عبرت الغافلین[1] کے عنوان سے جو معرکہ ان کا فاخر مکین کے ساتھ درج ہوا ہے۔ وہ شعرائے اردو کے پڑھنے کی چیز ہے۔ اسی طرح شیخ علی حزین کے خلاف جو اعتراضات خان آرزو نے اٹھائے تھے۔ ان کی ایک تفصیل مولینا صہبائی نے تنبیہ الغافلین[2] کے نام سے شایع کی ہے۔ وہ بھی "شعر فہمی" کے لئے ایک نہایت نافع رسالہ ہے۔

ظرافت

ہم مرزا کے کمال سخنوری کو قصیدہ گوئی اور ایک پُرشان و شوکت غزل کہنے کے تعلق سے اوپر لکھ چکے ہیں لیکن سودا کا ایک اور خاص طبعی جوہر جو اکثر تذکرہ نویسوں کو بہت کھٹکتا ہے اور انہیں

[1،2] عبرت الغافلین اور تنبیہ الغافلین کی زبان فارسی ہے۔

مصنفِ آبحیات بھی برابر شامل ہے) مرزا کی ہجو گوئی اور استہزا و تمسخر کی عادت ہے۔ چنانچہ وہ ابھی لڑکا ہی تھا کہ میر جعفر زٹلی سے اس کا ایک معرکہ ہو گیا۔ جس میں اس نے ایک تک بندیوں لگایا تھا ے سبز شاخے بزیر..... وارد۔ ؎

آجکل ادب اردو میں ظریف پرچوں کا جس قدر چرچا ہے۔ ویسا پہلے ہرگز نہ تھا۔ بلکہ مرزا سے پہلے بہ استثنا میر ضاحک جو ان کا ہمعصر تھا۔ اور کسی شاعر نے اپنے کلام میں ایک سنجیدہ و متین ظرافت ہرگز نہیں برتی تھی۔ سودا سے کچھ ہی پہلے میر جعفر زٹلی کا جس کے شاگرد و اتباع کا زمانہ گذر چکا تھا۔ لہذا ان کے کلام سے مرزا سودا نے ضرور استفادہ کیا ہو گا۔ کیونکہ صدہا ظریفانہ الفاظ ایسے ہیں جنکو ان ظریف شعرائے اپنے ہاں استعمال کیا ہے۔ ادھر انہی کو سودا نے بھی نظم کیا ہے۔ اِس وقت اردو میں اودھ پنچ کے پرانے فائل۔ اسکی مضحک نظمیں اور ان کے علاوہ رتن ناتھ سرشار وغیرہ کے پر ظرافت افسانے بہت دلچسپ تصوّر کئے جاتے ہیں مگر یہ خیال ہرگز دل میں نہیں لایا جاتا کہ سب سے پہلے کس کے

؎ ملاحظہ ہو آبحیات حالات سودا۔

قلم سے ایک مہذب ظرافت کی داغ بیل ڈالی گئی تھی یعنی وہ ہجو کے کانٹے جو حضرت سودا سے منسوب ہیں وہ خار نہیں ہیں۔ در اصل پھول ہیں کہ جنکے شگفتہ ہو جانے سے ہمارے چمن ظرافت کو اس قدر تر و تازگی بہم پہنچی ہے۔ چنانچہ میرزا فاخر مکین۔ ضاحک۔ فدوی اور بقا وغیرہ کے برخلاف سودا نے جو طومار باندھے تھے۔ رفتہ رفتہ زبان اردو میں انہی پر ایک ظریفانہ لٹریچر کی بنیاد ڈالی گئی تھی چونکہ بیاض ہذا میں اس امر کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے اس پر کچھ اور لکھنا یہاں مناسب نہیں ہے۔ البتہ تذکرہ نویسوں کی کوتہ عقلی پر سخت افسوس آتا ہے کہ وہ سودا کے ایک ایسے قابل جوہر کو بہ نظر ستائش نہیں دیکھ سکے۔ بلکہ اس کو مرزا کا ایک ذاتی عیب شمار کیا ہے۔ سچ ہے ؎ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

اگر آج سودا کو اردو زبان کا شیکسپیر قرار دیا گیا ہے تو یہ ان ہجوؤں ہی کی بدولت ہے کہ جن میں اس نے کسی حکیم۔ ملا۔ بشاعر۔ کوتوال شہر یا ایک ادنے بنیئے تک کے حالات

اور جزئیات مو بمو لکھدئے ہیں۔

میرو مرزا

میر تقی کا جوہر سخن ان کی چھوٹی چھوٹی غزلوں میں کھلتا ہے کیونکہ ان کے ہاں اول تو مضمون بہت کم ہے۔ دوسرے محاورہ بندی اور صنعتِ کلام کی قید بھی کچھ زیادہ ہے۔ مگر سودا کا نکتہ نظر بالکل جداگانہ ہے۔ وہ ہر ایک شعر میں بہت زیادہ مضمون کھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ایک بڑی بحر لامحالہ اسکو اختیار کرنی پڑتی ہے۔ مزید برین مرزا اپنے مخصوص محاورے بھی استعمال نہیں کیا کرتا تھا مگر اس کو یہ خیال ہمیشہ دامنگیر رہتا تھا۔ کہ اس کا اردو کلام متاخرین اہل فارس کے کلام کیطرح نہایت متین سنجیدہ اور ایک پرشان و شوکت انداز لئے ہوئے ہو۔ جسکے لئے اس کو کسی قدر گراں اور وزنی الفاظ بھی جابجا لانے پڑتے ہیں۔ پس اس قسم کے انداز میں صنعتِ شاعری خال خال برتی جاسکتی ہے۔ اسی

لیے سودا کا کلام صنعتوں سے یا نزاکت زبان سے عموماً عاری ہے۔ وہ تو صاف صاف ایک ٹکری بولی اپنے کلام میں کھپانا جانتا ہے۔ مگر میر صاحب دلی کے روڑے ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں اس میں ان کو یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ کوئی بات ایک لوہح اور خاص دہلویوں جیسے استعاروں۔ لب ولہجہ۔ اور بعض محدود محاوروں سے خالی نہ ہو۔ مثلاً

جنوں کا عبث میرے مذکور ہے۔ جوانی دوانی ہے مشہور ہے

گدا شاہ دونوں ہیں دل باختہ۔ عجب عشق بازی کا دستور ہے

ہوا حال بندے کا گو کچھ خراب۔ خدائی ابھی اس کی معمور ہے

گیا شاید اس شمع رُو کا خیال

کہ اب میر کے منہ پہ کچھ نور ہے

ان اشعار میں جوانی دوانی۔ عشق بازی۔ خدائی کا معمور ہونا۔ اور منہ پر کچھ نور وغیرہ یہ ایسے استعارے اور محاورے ہیں کہ اہل دہلی عموماً اپنی بول چال میں روزانہ انکو استعمال کیا کرتے ہیں۔ مگر سودا کہتا ہے ۔

غفلت میں زندگی کو نہ کھو گر شعور ہے	بہ خواب زیر سایہ بال طیور ہے
شمع و چراغ گو کہ مری شب ہی دور ہی	تو گھر میں ہو مرے تو اندھیرا بھی نور ہے
دل کو مرے ہوا سحر سے شگفتگی	غنچے کو گلستاں میں حیا سی سرور ہے

کنکر کہیں جو آئے ہے انکے قدم تلے

سودا انہیں یقیں ہی کہ یہ کوہ طور ہے

ان چاروں شعروں میں نہ تو زبان کا لوچ ویسا ہے جیسے کہ میر کے ہاں اور نہ ان سے دہلوی پن کچھ ٹپکتا ہے۔ مثلاً سایہ بال طیور۔ اہل زبان کے لئے کچھ اجنبی سا فقرہ ہے۔ میری شب بھی کچھ زیادہ فصیح نہیں ہے۔ غنچے کو حیا سے سرور اس میں کسی فارسی جملے کا چربہ اتارا گیا ہے۔ اردو والے کبھی ایسا نہیں کہینگے۔ آخری شعر میں کنکر کا قدم تلے آنا۔ اور اسکو کوہ طور خیال کرنا۔ یہ بھی دلی والوں کی نزاکت خیال سے قدرے دور ہے۔ لہذا میر و سودا میں یہی فرق ہے جو ایک اصلی۔ وطنی۔ اور خاص ملکی شاعر اور کسی اکتسابی شاعر میں ہو سکتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ سودا کا خاندان دلی کا خاندان نہیں تھا۔ اسکے بزرگ کابلی تھے۔ جو فارسی اور پشتو ملی جلی بولتے ہونگے

سودا بھی عنفوانِ شباب میں اسی لئے ناقص قسم کی فارسی غزلیں
کہتے رہے۔ جس پر شیخ علی حزین کا ان کو پوچ گو کہنا مقام تعجب
نہیں ہے۔ اس پر بدنصیبی یہ ہوئی کہ آپ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ کہ
جسکی زبان کا خود ہی کچھ ٹھیک نہ تھا۔ وہ کبھی تو ہندی زیادہ اور فارسی
کم اس انداز میں غزل کہتا تھا۔ اور کبھی فارسی زیادہ اور ہندی کم۔ یہ
ولی کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ گویا سودا کا کلام میر سے بہت مختلف
رہا ہی جسکا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ میر کے بزرگوں میں خان آرزو
ایک بڑے قابل اردو اور فارسی گو شاعر تھے۔ اس کے علاوہ شاہ
گلشن ہدایت اور میر درد جیسے خاص خاص دہلویوں کی صحبت
بھی پائی تھی۔ جو اردو کو اس کی ابتدا سے بخوبی جانتے تھے۔ اسکی
تمام گذشتہ ترقی و تبدیلی سے واقف اور خود بھی اس زبان کے موضوع
کرنے والے تھے۔ لہذا میر کی غزل اردو زبان کی شعر و شاعری کا
بہترین نمونہ ہے۔ مگر مرزا صاحب ان سب قدرتی اتفاقات سے
محروم رہے۔ اسی لئے ان کا درجہ میر سے کچھ کم ہے۔

اگر سودا کا قصیدہ میر تقی کے قصائد سے قدرے بہتر ہوتا ہے

تو اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ میر صاحب اپنے دل سے کسی کی ستائش کرنا نہیں چاہتے تھے گو اتنے بد دماغ بھی نہ تھے۔ اور نہ ان کو اہل فارس کیطرح بات کا بتنگڑ ابنانا آتا تھا لیکن سودا کو ان اوصاف میں گونہ کمال حاصل تھا۔ اسپر ادب فارسی کی میر سے زیادہ مزاولت تھی۔ اسی لئے ان کا قصیدہ میر تقی کے قصیدوں سے بدرجہا اچھا رہا۔ بلکہ ذوق کو چھوڑ (جو انہی کا تتبع کیا کرتا تھا) اردو میں سودا کا قصیدہ سب سے بڑھا ہوا ہے بلکہ اپنے قصیدوں میں ظرافت کی چاشنی جسقدر سودا نے بھر دی ہے وہ ذوق تو کیا انشا کے ہاں بھی نہیں پائی جاتی۔ پس ہم سودا کے ایک خاص قصیدے کا اقتباس بطور نمونہ یہاں درج کئے دیتے ہیں ؎

قصیدہ سودا
(تضحیک روزگار)

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار | رکھتا نہیں ہے دست عناں کا یک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفشِ پا کو گٹھاتے ہیں وہ لوہار

تنہا وہی نہ دہر سے عالم خراب ہے
نخوت سے اکثروں نے اٹھایا ہی ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے مزا جو ان کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھے ہیں ایک سو اتنا خراب و خوار

نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نے سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک بیاں کروں
فاقوں کا اسکے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایکبار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اسکا حال
کرتا ہے راکب اسکا جو بازار سے گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں یوں کہتے ہیں چمار

جسدن سے اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ
گذرے ہے اس نمط اسے ہر لیل و ہر نہار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا / چھکی کو آنکھ موند کے دیتا ہی وہ پہار

خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ / ہر دم زمیں پہ آپکو ٹپکے ہی بار بار

پیدا ہوئی ہے اسپہ اگن یاں اسقدر / ہرگز دروغ اسکو تو مت جان زینہار

گذرے وہ جسطرف سے کبھی اسطرف نسیم / بادِ سموم ہووے وہیں گر کرے گذار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کیطرف / کھووے ہے اپنے سُم سے کنوئیں ٹاپیں مار مار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی / گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار

ہے اسقدر ضعیف کہ اُڑ جائے باد سے / مینخیں گر اُسکے تھان کی ہوویں نہ استوار

نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اسکے پیٹ میں / دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لہار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سُرنگ / خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بیشمار

یہ چال اسکی دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق / چینگل سے موذی کے تو چھڑا اسکو کردگار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں / کہتے ہیں اسکے رنگ کو مگسی اہلِ اعتبار

تنہا نہ اسکے غم سے ہے دل تنگ زین کا / خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار

صورت کا اسکے دیکھنا ہیگا گدھی کو ننگ
سیرت سی اسکے نت ہی سگ خشمگیں کو عار

بدرنگ جیسی لید و بدبو ہی جوں پیشاب
بدبین یہ کہ اصطبل اجڑ کر بسے ہزار

حشری ہی اسقدر کہ بہ حشر اسکی پشت پر
دجال اپنے منہ کو سیاہ کرکے ہو سوار

اتنا وہ سرنگوں ہی کہ سب گر گئی ہیں اُکھڑ کر دانت
جبڑے یہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑے ہی مار

ہے پیر اسقدر کہ جو بتلائے اسکا سن
پہلے وہ لیکے ریگ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے ز روئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سی ہو سوار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا ہی زینہار

اک روز بدنصیبی سی اسپہ بندھائے زین
ہتھیار کچھ لگا کے ہُوا جا کے میں سوار

جس شکل سی سوار تھا اُسدن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھا دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
ٹک ٹک سے پاشنہ کے میرے پاؤں تھے فگار

آگے سی توبرہ اُسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکی تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اسطرح بھی نہ لاتا تھا وہ براہ
ہلتا نہ تھا زمین سے مانند کوہسار

اس مضحکے کو دیکھ ہوئی جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں یہی کہتے تھی یوں پکار

پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار

میں کیا کہوں غرضکہ مصیبت یہ جھیل کر
کہنے لگا جناب الٰہی میں یوں پکار

پہلے ہی چھوٹتے ہی کوئی گولا اسے لگے
یا تیر ایسا اسکو لگے ہو جگر کے پار

لیجاویں چور یا مرے یا ہو کہیں یہ گم
اس تین بات سی کوئی جلدی ہو آشکار

انوری کا ایک قصیدہ بھی گھوڑے کی ہجو میں ہے جسکا ایک شعر ہے ؎

نہ از غبار خاستہ بیروں شدے بزور
نہ از زمین خستہ بر انگیختے غبار

مولانا شبلی مرحوم شعر العجم جلد اول میں لکھتے ہیں کہ سودا نے جو قصیدہ گھوڑے کی ہجو میں لکھا تھا وہ انوری کے اسی قصیدے کا تتبع تھا غرض سودا کی تمام شاعری شعرائے ایران کی غزلیات و قصاید

سے مستفاد ہے ۔ پھر اسی سے ذوق اور غالب نے بیشتر استفادہ
کی ہے مثلاً سودا کا ایک شعر ہے ؎

جی کی جی ہی میں رہی یار میرے بالیں تک
پہنچا اس وقت کہ کچھ بات نہ ہونے پائی

مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے اسے بالیں پہ مرے پر کس وقت

سودا کا ایک مطلع ہے ؎

کیا جانے کس کی خاک ہے رکھ ہوش نقش پا
یوں رکھ قدم کہ تا نہ دبے دوش نقش پا

ذوق نے اسی کو الٹ پلٹ کر اپنی ایک غزل کا مطلع کہا ہے ؎

رکھتا بہر قدم ہے وہ یہ ہوش نقش پا
ہو خاک عاشقاں نہ ہم آغوش نقش پا

میر اور سودا کی غزلوں میں جو نمایاں فرق پایا جاتا ہے ۔ اور
ایک کے کلام کو آہ اور دوسرے کے کلام کو واہ بتایا جاتا ہے ۔ اس

کا سبب آزاد نے میر صاحب کی طبیعتِ قدرتی ندو خیز اور دل حسرت انگیز اور سودا کی طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر قرار دیا ہے۔ مگر یہ بات حقیقتاً صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ زمانۂ موجودہ میں داغ اور غالب دونوں کی طبیعتیں عموماً بشاش اور ہر وقت شگفتہ پائی گئی ہیں۔ مگر باوجود اسکے ان کی غزلوں میں سوز و گداز وغیرہ کے سب اوصافِ شاعری موجود ہیں۔ غرض سودا کی غزلوں میں بھی دردناک اشعار ضرور ہیں۔ مگر ان کے علاوہ وہ اور بھی بیسیوں مضامین اپنی غزل میں کھپا گئے ہیں۔ حالانکہ میر کی غزل کا اکثر حصہ زار نالی ہی کے مضامین سے پُر ہوا کرتا تھا علاوہ بریں سودا کی غزلوں کی زمینیں بھی بہت مشکل ہیں۔ اور وہ اہل فارس کے کلام سے ان کو وضع کرتے ہیں۔ اسی طرح میر کے ہاں ہر غزل کی زمین اور ردیف و قافیے وغیرہ مضمون غزل کے تابع رکھے گئے ہیں۔ اسی سے ان کی ہر غزل اور سب شعرا کی عشقیہ غزلوں پر سبقت لے گئی ہے۔ چونکہ شاہ نصیر نے سنگلاخ زمینوں کی بہت پابندی کی تھی۔ اسی لئے اس کے کلام میں سودا کی غزلوں سے بھی زیادہ پھیکا پن پایا جاتا ہے۔ اور غزلیات میر سے

تو اسکو کچھ نسبت ہی نہیں ہے۔ حضرت میر درد بھی میر تقی ہی کے ہمعصر تھے۔ جنکو اس قدر اطمینانِ خاطر حاصل تھا کہ جب مرہٹوں سے مرعوب ہو کر دلّی بالکل تباہ ہو گئی اور سب اردو گو شعرا اس شہر کو چھوڑ گئے تو اُن کے پائے استقلال کو کچھ جنبش نہیں آئی۔ اور بظاہر رنج وملال کے کوئی آثار ان کے بُشرے میں نہیں پائے جاتے تھے تاہم غزلیں ان کی سوز وگداز میں میر کی غزلوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ اسکی وجہ یہ کہ وہ بھی اوّل تو غزل کے اشعار کی مقدار بہت کم رکھتے تھے دوسرے اپنی غزل کا اکثر حصہ یاس وحسرت کے خیالات پر موقوف رکھتے تھے۔ اور مرزا سوؔدا کی طرح کسی غیر زبان کی شاعری اور تنوعِ خیالات کے چنداں پابند نہ تھے۔ پس جو شاعر ایک مخصوص رنگ اپنے کلام میں پیدا کیا چاہے۔ اسکو اپنے اشعار میں مناسب زمینوں اور ردیف وقافیہ کے انتخاب کے علاوہ زیادہ تر وہی مضامین بار بار لکھتے رہنا چاہیے۔ جیسے کہ میؔر اور درؔد کا خاص شیوہ تھا۔

سودا کی یہ رباعی نہایت درد انگیز ہے ؎

رُباعی[۱]

سودائے دُنیا تو بہر سُو کب تک | آوارہ ازیں کوچہ باآں کوکب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دُنیا ہووے | بالفرض ہوا یُوں بھی تو پھر تو کبتک

گلزارِ نسیم اور مثنوی بدرِ مُنیر

مثنوی سحر البیان یا بدر منیر ۱۱۹۳ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ اور گلزار نسیم ۱۲۵۴ھ میں۔ پنڈت برج نرائن صاحب چکبست مباحثہ گلزار نسیم میں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ مثنوی سحر البیان کا جب لکھنو میں چرچا ہوا۔ تو اس سے متاثر ہو کر پنڈت دیا شنکر نسیم نے مثنوی گلزارِ نسیم لکھی تھی۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ مگر یہ قصہ دراصل زبانِ ہندی اور صوبہ بنگالہ سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ مذہب عشق یا نثر میں قصہ گل بکاولی جو عام طور سے

[۱] یہ عیش و نشاط کامرانی کب تک | عشرت بھی رہی تو نوجوانی کب تک

مشہور اور متداول ہے۔ اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اس قصے کو عزت اللہ بنگالی نے ۱۱۲۴ھ کے قریب مرتب کیا تھا۔ اور وہ کچھ نثر میں اور کچھ نظم میں بزبانِ فارسی لکھا گیا تھا۔ مگر وہ سب سے پہلا نسخہ نہیں تھا۔ کیونکہ ایک انگریزی تذکرہ شعرائے ریختہ میں مذکور ہے کہ یہ قصہ دکنی اردو میں سب سے اوّل ۱۰۳۵ھ میں منظوم ہوا تھا۔ اور اس کی زبان کا انداز یہ تھا ؎

برس ایک ہزار ہور پنج تیس میں
کیا ختم یوں نظم دن بیس میں
سنوناں[1] ہوں اک شہر کا تاجدار
دھری مال ہور[2] مملکت بیشمار

اس نسخہ کی تصنیف کے بعد پھر اسکو بنام تحفہ مجلس سلاطین جس سے ۱۱۵۱ھ سال بر آمد ہوتا ہے۔ دوبارہ نظم کیا گیا تھا۔ اور اب کے اس کی زبان قدرے اچھی تھی۔ مثلاً اس کا عنوان ہی ؎

حمد کر اس خدائے یکتا کی! چشم دل تیری جس نے بینا کی

پھر ۱۲۱۲ھ میں ریحان نے اس کو سابقہ نسخوں سے بدرجہا بہتر زبان

[1] سنوناں (سنانا) [2] ہور (اور) پنجابی الفاظ ہیں۔

میں نظم کیا تھا جس میں وہی بحر قائم کی کہ جو آجکل گلزار نسیم کی بحر ہے۔ یہ کتاب لکھنو کے توپخانہ کی لائبریری میں غدر سے کچھ پہلے موجود تھی۔ اور اس کے عنوان کا یہ شعر تھا ؎

ساقی ہیں تری ادا پہ قرباں صدقے مئے و جام کے مری جاں

اس کے چالیس باب تھے۔ اور عام مثنویوں کی روش سے بالکل جداگانہ تھی۔ کیونکہ اس میں استعارے اور کنائے بکثرت مستعمل ہوئے تھے۔ اس کا نام بھی خیاباں تجویز کیا گیا تھا۔ اور ہر باب گلگشت کے نام سے موسوم ہوا تھا۔ غالباً نسیم نے اسی نسخہ سے مستفاد ہو کر یہ نظم لکھی ہو گی۔ کیونکہ اس کے دیوانِ اشعار سے یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے۔ کہ وہ کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھا۔ یعنی باوجودیکہ نہایت ہی آسان ردیف و قوافی میں اس نے اپنا دیوان کہا ہے۔ مگر پھر بھی اس کو گلزار نسیم کے ایسے مصنف سے کچھ نسبت معلوم نہیں ہوتی۔ تذکرہ نویسوں نے جن میں مولینا آزاد بھی شامل ہیں۔ اس مثنوی کی بابت لکھا ہے۔ کہ دراصل یہ نظم بہت ضخیم تھی دبیشک یہ قول صحیح ہے کیونکہ خیابان

بھی چالیس باب میں منقسم تھی) اس کو پنڈت صاحب موصوف جب اپنے استاد آتش کے پاس لے گئے۔ تو اُن کی وساطت سے اس کا اختصار کر لیا گیا تھا۔

مگر شوق لکھنوی فرماتے ہیں[1] کہ سنہ ۱۲۱۷ء میں رفعت نے یہی قصہ فارسی زبان میں نظم کیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں مثنویوں کے شعروں میں بالکل مطابقت پائی جاتی ہے مثلاً

رفعت	نسیم
عازم بہ سفر شدند ہر چار	شاہزادے ہوئے وہ چاروں تیار
زیں شان بہ بر پدر شاہ ناچار	رخصت کئے شاہ نے چاروناچار
گفتند کہ چشم شاہ شد کور	سلطان زین العابدین شہ زور
تا چند ز عارض پسر نور	دیدار پسر سے ہو گیا کور
بارے چوں رخش ترا نماید	پیارا یہ وہی کہ دیکھ اسی کو
بینائی چشم تو رباید	پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو

گویا تحفہ مجلس (مرتبہ ۱۱۵۱ھ) سے خیابان (سنہ ۱۲۱۲ھ) خیابان سے باغ و بہار

[1] بحوالہ مخزن جنوری سنہ ۱۹۱۰ء

(۲۱۷ھ) اور اس سے گلزار نسیم ۱۲۵۴ھ میں مرتب ہوئی ہوگی۔ ان مثنویوں کے ناموں میں بھی خاص مناسبت پائی جاتی ہے۔

گلزار نسیم پر حضرت شرر نے جسقدر اعتراضات کیے ہیں۔ انکے کافی سے زیادہ نہایت مؤثر طریقے میں اودھ پنچ کیطرف سے جوابات شایع ہو چکے ہیں۔ اور وہ تمام معرکہ و مجادلہ مباحثۂ گلزار نسیم میں طبع بھی ہو چکا ہے۔ اس لئے یہاں اسکی طرف اعادہ کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ شعرا کو یہ کتاب ضرور غور سے پڑھنی چاہئے۔

شرر کا ایک بہت بڑا اعتراض کہ جس پر اس تمام بحث کا انحصار ہے۔ اور جس سے ہواخواہان نسیم زیادہ تر برانگیختہ ہیں۔ یہ تھا کہ گلزار نسیم پنڈت دیا شنکر کی لکھی ہوئی مثنوی ہی نہیں ہے۔ بلکہ حضرت آتش نے پہلے اس کو بطور تفنن لکھا اور پھر اپنے ہونہار شاگرد کے نام اسے منسوب کر دیا یہ محض افترا ہے۔ کیونکہ اس مثنوی کے مصنف پنڈت صاحب موصوف ضرور ہیں۔ مگر ان کو اس مثنوی کے لکھنے میں شعرائے متقدمین سے اسی طرح مدد

ملی تھی۔ جیسے کہ دقیقی نے اپنے سے پہلے شعرا کے کلام سے استفادہ کر کے شاہنامہ کا ایک ابتدائی حصہ مرتب کر لیا تھا۔ اور پھر اسی بنا پر فردوسی نے ایک شاندار محل قائم کر کیا۔

گلزار نسیم کا اصلی نسخہ ہندی میں تھا۔ اور یہ جنوبی ہند کی مختلف زبانوں میں کبھی نثر اور کبھی نظم کے لباس میں مرتب ہوتا رہا ہے آخر ۱۸۳۸ء میں یہ گلزار نسیم کے نام سے تصنیف کیا گیا تھا۔ ایک نمونہ اس مقام سے جہاں بکاولی اپنے پھول کے چوری ہو جانیکا غم کرتی ہے۔ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ شاعری اگر قافیہ پیمائی نہیں ہے بلکہ رنگین کلامی ہے جیسا کہ شعرائے لکھنو کا عام اعتقاد ہے تو اس خاص وصف میں گلزار نسیم سب مثنویوں پر فائق ہے مثلاً

(آوارہ ہونا بکاولی کا تلاش گل میں)

گل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاولی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرش گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی | پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے | کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل | جھنجھلائی کہ کون دیگیا جُل
ہے ہے مرا پھول لیگیا کون | ہے ہے مجھے خار دیگیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے | بُو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل | سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا | شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا
اپنوں میں سے پھول لیگیا کون | بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون
شبنم کے سوا چُرانے والا | اُوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے | جس گھر میں ہو گُل چراغ ہو جائے
گلچیں کا جو ہاے ہاتھ ٹوٹا | غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل | مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او باد صبا ہوا نہ بتلا | خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتا

بُلبُل تو چہک اگر خبر ہے!
گُل تو ہی مہک بتا کدھر ہے!

مثنوی سحر البیان

تذکرہ آب حیات میں اس نظم کے متعلق آزاد لکھتے ہیں۔ کہ میر حسن مرحوم نے اسے لکھا۔ اور ایسی صاف زبان۔ فصیح محاورے اور میٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا۔ جیسے آبِ رواں اصل واقعہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ قریب قریب یہی رائے مولانا حالی نے اس مثنوی کے متعلق اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں تحریر کی ہے۔ مگر میرے نزدیک میر حسن کا سارا کمال یہ ہے کہ وہ کسی واقعہ کے جزیات جیسے کہ طبعاً مشاہدہ کئے گئے ہوں۔ ویسے ہی سلیس زبان میں مسلسل لکھدیتے ہیں۔ حالانکہ اُردو کی اکثر مثنویوں میں شعرا اول تو کسی واقعہ کے جزیات ہی اسقدر جمع نہیں کرتے۔ پھر اگر کرتے بھی ہیں تو ان کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ نظم میں نہیں کھپا سکتے۔ پس اور مثنویوں اور میر حسن کی مثنویوں میں یہی ایک بین فرق ہے۔ ورنہ جہاں تک حسن و عشق کے مضامین کا تعلق ہے۔ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ شاعر بھی

ان کو کافی حد تک ایک موثر پیرائے میں ادا کر سکتا ہے۔ بلکہ کیا گیا ہے۔ اس نازک شاعرانہ نکتہ کی توضیح کے لئے ہم مثنوی سحرالبیان کا ایک اقتباس یہاں درج کرتے ہیں۔

(داستان حمام کے نہانے کی لطافت میں)

یعنی شاہزادہ بےنظیر غسل کرتا ہے۔ یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ مگر ذرا دیکھنا نہانے کے متعلق کوئی چھوٹے سا چھوٹا امر واقعہ بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے

کدورت میرے دل کی دھو ساقیا | ذرا شیشۂ مے کو دھو دھا کے لا
کہ سرگرم حمام ہے بےنظیر | گیا ہے نہانے کو بدر منیر
ہوا جبکہ داخل وہ حمام میں | عرق آگیا اس کے اندام میں
تن نازنیں نم ہوا اس کا کل | کہ ڈوبے ہے شبنم میں جس طرح گل
پرستار باندھے ہوئے لنگیاں | نہ وہ پھر سے طاس ایک وہاں
لگے ملنے اس گلبدن کا بدن | ہوا ڈھڈھا آب سے وہ چمن
نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک | برسنے میں بجلی کی جیسے چمک
لبوں پر جو پانی پڑا سر بسر | نظر آئے جیسے وہ گلبرگ تر

ہوا قطرۂ آب یوں چشم کو مس | کہے تو پڑی جیسے نرگس پہ اوس
لگا ہونے ظاہر جو اعجازِ حسن | ٹپکنے لگا اس سے اندازِ حسن
گیا حوض میں جب شہِ بے نظیر | پڑا آب میں عکس ماہ منیر!
وہ گورا بدن اور بال اسکے تر | کہے تو کہ ساون کی شام و سحر
نمی سے تھا بالوں کا عالم عجب | نہ دیکھی کوئی خوب تر اس سے شب
زمرد کی لے ہاتھ میں سنگِ پا | کیا خادموں نے جو آہنگِ پا
ہنسا کھل کھلا وہ گلِ نو بہار | لیا کھینچ پاؤں کو بے اختیار
عجب عالم اس نازنیں پر ہوا | اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا
ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے | ہوئے جی سے قربان چھوٹے بڑے
کیا غسل جب اس لطافت کیساتھ | اڑھا کھیس لائے اسے ہاتھوں ہاتھ
نہا دھو کے نکلا وہ گل اسطرح | کہ بدلی سے نکلے ہے ماہ جسطرح

غرض شاہزادے کو نہلا دھلا
دیا خلعتِ خسروانہ پہنا

اس نظم میں شاہزادے کا گرم حمام میں داخل ہونا۔ وہاں اس کا پسینہ چھوٹنا۔ پھر تمام بدن نرم ہو جانا۔ اور ملازموں خادموں

کا لنگیاں پہنکے۔ نہلانے کے سازوساماں سمیت آنا۔ شہزادی کو مل مل کے نہلانا۔ اس کا بدن کندن کی طرح چمکنا۔ گلابی ہونٹوں کا صاف ہو کر پھول کی طرح نظر آنا۔ اور آنکھوں وغیرہ یا نمک سنگ کا دھو دھلا کر خوبصورت دکھائی دینا۔ پھر شاہزادے کا حوض میں بیٹھنا۔ وہاں اس کا گورا بدن پانی میں صاف دکھائی دینا۔ اور بالوں کو کھلے پانی میں صاف کرنا۔ پھر جب وہ سب بدن کا غسل کر چکا تو خادموں کا اس کے پاؤں کو جھاواں لے کے میل اتارنا اور اس کا مسکرا دینا۔ بعد غسل کے شاہزادہ کو کھیس اٹھانا اور آخر لباس شاہانہ پہنا دینا۔ یہ ساری باتیں کیسی ترکیب کے ساتھ نظم کی ہیں کہ ایک پامال و پا افتادہ مضمون بھی نہایت پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ بس یہی میر حسن کا اصلی جوہر ہے۔ جو اور مثنویوں میں اس قدر جامعیت اور سلاستِ زبان کے ساتھ نہیں پایا جاتا۔ یہ مضمون ہم نے اس لئے تفصیل سے لکھا ہے کہ میر حسن کی مثنویوں میں فصاحت بیان کی جو خوبی اعلٰے درجے پر پائی جاتی ہے۔ اس سے کچھ سبق حاصل کیا جائے۔

مثنویاتِ میر حسنؔ

میر حسن کی دو مثنویاں سحر البیان و گلزارِ ارم مخزن لاہور
سے ابتک شائع ہو چکی ہیں۔ اس کی ایک تیسری مثنوی بھی تصنیف
شدہ ہے۔ جس کی طرف آزاد نے آبِ حیات میں اور لالہ سری رام
نے خمخانہٴ جاوید میں اشارہ کیا ہے۔ اس کے متعلق ایک
انگریزی تذکرے میں لکھا ہے کہ یہ ایک مثنوی صرف تیس صفحے
کی ۱۸۰ اشعار پر مشتمل تھی۔ اور محض نواب آصف الدولہ کی
تعریف میں لکھی گئی تھی۔ جس کا وزن یہ تھا ؎

لکھوں میں کیا ثنائے حمدِ رزّاق کہ گویائی کی طاقت ہے یہاں طاق

یہ اس مثنوی کا ابتدائی شعر ہے ؁

دیوانِ میر حسنؔ

یہ ۱۱۹۲ھ سنہ ہجری میں بمقام فیض آباد مرتب ہوا تھا۔ اس کے
بعد میر حسن وہاں سے لکھنؤ چلا آیا - اور غزلیات کی نسبت

زیادہ تر مثنویوں کی تصنیف میں معروف ہوگیا تھا۔ چنانچہ اپنے بیٹے میر مستحسن خلیق کی غزلوں کی اصلاح کرنے سے بھی انکار کر دیا اور اس کو مصحفی کے سپرد کر دیا تھا۔ یہیں سے اس کے خاندان میں قدیم عشقیہ غزل گوئی سے نفرت اور غزل کے علاوہ اور اصناف سخن کی طرف میلان پیدا ہوا۔ چنانچہ دیوان میر حسن جس طرح زیادہ مدون نہیں ہوا یا قصداً مدون نہیں کیا گیا تھا۔ اسی طرح اس کے خاندان میں دواوین خلیق و خلق بھی غالباً بالارادہ محفوظ کر لئے گئے تھے۔ اور ان کو زیادہ اشاعت نہیں دی گئی تھی۔ کیونکہ سارے گھرانے کے گھرانے کا خیال مرثیہ گوئی اور اس کے دینی و دنیوی مفاد کی طرف راجع ہوگیا تھا۔

آزاد نے اپنے تذکرے میں اخلاف میر حسن کی نسبت یہ شکایت کہیں لکھی تھی کہ انہوں نے اپنے کمال کے سامنے دیوان حسن وغیرہ کو حقیر سمجھا اور اس کو چھپنے نہ دیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ آبحیات کے لئے مسلّم پانچ غزلیں بھی انکو دستیاب ہونا سخت مشکل ہوئیں۔ لیکن اب دیوان میر حسن کا ایک خلاصہ

مطبع نولکشور سے طبع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ میر حسن کا تذکرہ شعرائے ریختہ بھی انجمن ترقی اردو نے شایع کر دیا ہے۔ دیوان میر حسن میں ایک شعر ہے ؎

کہہ بیٹھ نہ دل جی ترا جس بُت سے لگا ہے
اللہ کی چوری نہیں تو بندے کا کیا ہے

ذوق کہتا ہے ؎

پلائے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری
کہ اللہ کی نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

اسی غزل کا دوسرا شعر میر حسنؔ فرماتے ہیں ؎

بارے وہ صنم مجھ سے ملا خود بخود آ کر
سچ ہے کہ نہیں جس کا کوئی اس کا خدا ہے

میرزا غالب فرماتے ہیں ؎

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ!
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے!

میر حسنؔ نے اپنے تذکرہ میں شاہ واقفؔ کا ایک شعر لکھا

ہے ؎

جنّت و سایۂ طوبےٰ نہیں درکار مجھے
بس ہے اے یار تیرا سایۂ دیوار مجھے

اسی کو ذوق نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

کام جنت میں ہے کیا تیرے گنہگاروں کا
ہم ہیں اور ہے سایہ تری کوچہ کی دیواروںکا

دیوانِ نسیم

پنڈت دیاشنکر نسیمؔ کا یہ عشقیہ کلام مطلق اس کی شان کے شایاں نہیں۔ غالباً یہ اس کی ابتدائی مشق ہوگی۔ جس کی ناکامی سے پنڈت صاحب موصوف مثنوی کیطرف جھک پڑے۔ اور اس میں ایک درجہ یکتائی حاصل کیا۔ ہم اس بیاض میں غزلوں کا اندراج ممنوع سمجھتے ہیں۔ مگر اس جگہ نسیمؔ کے کچھ اشعار اس لئے لکھدیئے گئے ہیں۔ کہ ان سے یہ اندازہ ہوسکے کہ وہ بلحاظ

لکھنوی شاعر ہونے کے معمول سے زیادہ استعارے و کنائے اپنی غزلوں میں نہیں برتا کرتے تھے۔ لیکن مثنوی میں یہ شعار کیوں اختیار کیا گیا تھا۔ اس کے بعض خارجی اسباب تھے جو اوپر لکھے جا چکے ہیں +

اشعارِ نسیم

مژدہ اے دل کہ تو بھولے ہوئے کو یاد آیا
نئی سمجھاؤں خوشی وہ بیتِ نوشاد آیا

محتسب صحبتِ بدمست میں پاتا ہے گذر
خون فاصد نے کیا جوش تو فصاد آیا

تیرے دیوانے کا در بار لگا رہتا ہے
گیا فصاد اگر گھر سے تو حداد آیا

بادہ نوشی میں ہوا پیرِ مغاں کا جو گذر
چپکے چپکے کہا شاگردوں نے استاد آیا

عشرتِ آبادِ چمن سے تجھے کیا تُو تو نسیمؔ

نکہتِ گل کی طرح ہونے کو برباد آیا

سطور ذیل میں آتشؔ کے ایک شاگرد کے (جو رندؔ و وزیرؔ سے مرتبہ میں کچھ زیادہ نہ تھا) چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ ان سے اوپر کے شعر مقابلہ کر کے دیکھو تو ظاہر ہو جائیگا کہ نسیمؔ چنداں رنگیں طبیعت نہیں رکھتے تھے۔ مگر یہ خاص طرز صرف مثنوی گلزار نسیم کے لئے اختیار کی گئی تھی۔ جیسے اوپر لکھا جا چکا ہے۔ غزل صباؔ

اے صبا جذب پہ جس دم دلِ ناشاد آیا

اپنی آغوش میں اُڑ کر وہ پریزاد آیا

محو ابرو کے لئے خنجرِ فولاد آیا

ذبح کرنا بھی نہ تجھکو میرے جلّاد آیا

سرکشی پر جو وہ سروِ ستم ایجاد آیا
پاس اڑرے کے گھٹتا ہوا شمشاد آیا

دمِ آغازِ جنوں طوقِ گلوگیر ہوا
غل مچانے بھی نہ پائے تھے کہ حداد آیا

دل میں اک درد اٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے ۱؎
بیٹھے بیٹھے مجھے کیا جانے کیا یاد آیا

مژۂ یار کی نشتر نے کیا سودائی
خونِ فاسد کی طرح جوش میں فصاد آیا

بیت ہستی کے صفا ہو گئے معنی روشن
خواجہ آتش سا زمانے میں جو استاد آیا

۱؎ یہ شعر آجکل ہر شخص کی زبان پر ہے۔

میر انشاء اللہ خاں انشا

(وفات ۱۸۱۷ء)

شعراء عموماً ایک یا دو زبانوں میں بہت اچھا شعر کہہ سکتے ہیں بلکہ عموماً اپنی مادری زبان ہی میں درجہ کمال حاصل کیا کرتے ہیں۔ لیکن انشا کو اردو فارسی۔ عربی۔ پشتو۔ ترکی۔ بھاشا وغیرہ بہت سی زبانوں میں شعر کہنے کی اچھی خاصی مہارت تھی۔ لہٰذا ان کا کلیات ادب اردو میں کلہم ایک نادر چیز ہے۔ جس کی طرف شعرائے اُردو کو خاص طور سے متوجہ ہونا چاہیے۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ کلیاتِ انشا نہایت غلط چھپا ہوا ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے۔ اور اس کی تصحیح کا کبھی کسی شخص کو خیال ہی پیدا نہیں ہوا۔ غالباً اس وجہ سے کہ آجکل اس کو بہت کم پڑھا جاتا ہے۔

ادب اردو کا ایک خاص رکن زمانہ موجودہ میں مہذب ظرافت بھی ہے۔ اس لئے انشا کی سوانحعمری اور اس کا کلام اس فن کے شائقین کے لئے خاص طور سے مفید اور استفادہ

کے قابل ہیں۔ مثلاً سید انشا کے اکثر حالات تذکرہ آبحیات میں موجود ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مزاح وظرافت کا مشغلہ جب ایک خاص حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو اکثر نتائج بد پیدا کرتا ہے چنانچہ میر انشا اللہ خاں کہ نواب سعادت علیخاں کی مونچھ کے بال تھے۔ آخر ان کو اسی جا و بیجا چھیڑ خانی اور مزاح کی بدولت اتنا ذلیل ہونا پڑا کہ رفتہ رفتہ حالت بہ دیوانگی پہنچی۔ اور نہایت تنگی و عسرت کی حالت میں وفات پائی[1]

انگریزی لٹریچر میں سید انشا کے متماثل ٹھیوڈور ہک ایک طباع و بذلہ سنج شاعر کے حالات موجود ہیں۔ جو اسی طرح فنِ مزاح کی بے اعتدالیوں اور اپنے وسائلِ معاش سے لاپرواہی کے باعث فاتر العقل ہو گیا تھا۔ میری دانست میں آزاد نے جو انشا کی آخیر زندگی کے دردناک حالات میاں رنگین کی زبانی لکھی ہیں۔ وہ قرائن سے بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ خواہ بقول جناب عبدالحق صاحب (بحوالہ دیباچہ گلشن ہند) وہ کسی مستند تذکرہ سے پایہ ثبوت تک نہ پہنچے ہوں۔

[1] شیریڈن کا ہمعصر تھا۔

سید انشاء اللہ خاں ۱۲۱۵ھ تک میرزا سلیمان شکوہ کی غزل کی اصلاح کرتے رہے۔ بعد اس کے نواب سعادت علیخاں کے ہاں رسائی پیدا کی۔ اور ۱۲۳۳ھ ہجری میں وفات پائی۔ آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں۔ پہلے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ جب سید انشا پہنچے تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا۔ بزرگوں سے سُنا اور طرز کلام سے بھی معلوم ہوا ہے کہ شاہزادہ موصوف کے ہر دیوان کی غزل اور اکثر اور غزلیں سیّد موصوف ہی کی کہی ہوئی ہیں۔ چنانچہ مطلع ان مطالب کو روشن کرتا ہے۔ کیونکہ سید انشا ایسی تضمینوں کے بادشاہ تھے ؎

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا
توکلتُ علے اللہ تعالےٰ

یہ بات میری دانست میں بہ وثوق نہیں کہی جاسکتی کہ یہ تضمین سید انشا ہی کا خاص حصہ تھی۔ کیونکہ زبان عربی کے ایسے معمولی مذہبی فقرے اور شاعروں نے بھی کلامِ اُردو میں تضمین کئے ہیں مثلاً میر تقی میرؔ فرماتے ہیں ؎

دل لبا پہنچا ہلا کی کو نیٹ کھینچ کسالا   لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ

ایشیاٹک سوسائٹی کی تحقیقات سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا سلیمان

شکوہ کے دو دیوان تھے ایک کا مطلع یہ تھا ؎

وابستہ ہے جو مرضی خلاق جہاں کا

کچھ فکر دل اس کے ہیں یہاں کا ہی نہ وہاں کا

اور یہ ۱۲۲۵ ہجری میں مرتب کیا گیا تھا - دوسرا دیوان جس

کا مطلع سید انشا سے منسوب ہے - اس کی تاریخ طبع معلوم نہیں

ہوئی - زمانہ حال کے وہ شعرا جو صرف مسلسل اور نیچرل نظمیں لکھنا

اپنا مقصدِ زندگی قرار دے چکے ہیں - ان کے لئے کلیاتِ انشا

میں مسلسل نظمیں بمقدار کافی موجود ہیں - بلکہ ظریف - ہزال اور پنچوں

کی طرز کے سخن طراز شعرا کو تو اس کلیات میں غالباً کلیات سودا

سے بھی کچھ زیادہ مصالحہ بہم پہنچتا ہے - ہم انشا کے کلام سے

کچھ کچھ نمونے تفریح طبع کی غرض سے یہاں قلمبند کرتے ہیں -

(مثنوی در ہجو زنبور)

ان بھڑوں نے کیا یہ ایک قہر   کہ ہوا زرد پوش سارا شہر

دیکھئے ان کی یہ جوانمردی | سب پر اک اپنی پھیر دی زردی
باغ میں بھر جو خیل خیل گئے، | سارے چنبا کے پھول پھیل گئے
موہے کی یہ زرد زرد پھلیں ہیں | یا کل اشرفی کی کلیاں ہیں
کیا کہے ان کو کوئی دانشمند | کر دیے ہیں انہوں نے رستے بند
مولسریوں کے نیچے دیکھئے جب | کھرنیاں سے بکھر رہے ہیں سب
جاکے کوٹھوں کی کوئی دیکھے بہار | زرد چنبلی کے پڑے ہیں ہار
اڑ گئی وہ سفیدی اور اودی | اب جدھر دیکھو زرد داودی
پھر جو شاخوں سے ہر شجر کے اڑے | تو املتاس ہی کے پھول جھڑے
ساری دیواروں پر قطار قطار | زرد مرچوں کے سوکھتے ہیں ہار
کامک اور نانگ اور سپروائی | لگے گانے بسنت رت آئی
تھے درختوں کے جو بندھے ٹڈے | ان میں زنبور کے لگے چھتے
بنگیا تاک خانہ زنبور | ہو گئے زرد خوشہ انگور
آئے زنبور کو الٰہی مرگ | جن کی دولت ہوا یہ دل صد مرگ

ان بھڑوں کا یہ کچھ ہوا احوال | جس طرح ہوں بنولیاں پامال

غور کیجے تو ان کے فرع وصول | سینکڑوں کوس ہیں ترئی کے پھول
ہل بے زنبور تیری شان وشکوہ | بھر گیا جعفری سے دامن کوہ
بوئے گل اپنی ہوش بھول گئی | سامنے اس کے سرسوں پھول گئی
آکے بادل برس گئے سونا | ان بھڑوں سے بھرا ہرا اک کونا
تھی جو دریا کے گرد کی ریتی | وہاں ہوئی زعفران کی کھیتی
فوج زنبور دیکھ مور و ملخ | ہوئیں ٹھنڈک سے چھاتیاں سب یخ
ان کے الجھیڑوں میں جو آکے پھنسے | ق | قہقہہ مار کر نہ کیونکہ ہنسے
کھیل کر اپنے جی پہ آتے ہیں | گال لوگوں کے توڑ کھاتے ہیں
خلطہ کی خوبی ہونٹ توڑ لیا | جسے چاہا اُسے بھنبھوڑ لیا

ان کی آفت جو دشت نے جھیلی | پھولی اس میں بھی زرد چنبیلی
گانٹھ ہلدی کی ہیں یہ زہریلے | سانپ کی طرح ہو کے لہریلے
بسکہ چمٹے جو آکے یہ بدبخت | ہو گئے زرد پوش سارے درخت
زعفرانی پہنکے ایک قبا | اڑ چلے اب چمن میں باد صبا
نیش زنبوروں نے زبس توڑے | سب نے مانجھے کے پہنے ہیں جوڑے

جو کوئی نیک بخت جنتی ہے — اس کی پوشاک بھی بسنتی ہے
ہوئے دشمن جو کوئے کونے کے — نگیے سب پلنگ سونے کے
خوب روئی یہ توشکوں میں بھری — ساری اڑ چلیاں جیسے زرد پری
اور تکیوں کے کیا کروں اوصاف — چڑھ گئی سب یہ زرد زرد غلاف
بل بے زنبور تیرا چھومنتر — شبو کے رنگ کی ہوئی چادر

بو العجب قہر ہیں یہ سب زنبور — ہلدیا زہر ہیں یہ سب زنبور
ان لعینوں کی دیکھیے جلدی — جا کے دریا میں گھولدی ہلدی
آندھیاں زرد رنگ کی چلیاں — ہو گئیں زرد شہر کی گلیاں
سارے زنبور ہی اب آئے نظر — ہے کچھ انشا بسنت کی بھی خبر
یعنی کچھ لکھیے سو یہ کیا مقدور — کاٹے کھاتے ہیں ہاتھ کو زنبور

بس الٰہی آگے سب بکھیڑا ہے
بھڑ کے چھتے کو تو نے چھیڑا ہے

مثنوی در ہجو کھٹمل

کچھ یہ کھٹمل بڑے ہیں اب کے سال — کہ ہوئی سب زمین لالوں لال

چھا گئے ہیں جو سارے یہ کمبخت — شاخ مرجاں بنے تمام درخت
بسکہ جا کر جمے قطار قطار — ہو گئے لالہ نرگس بیمار
اب جدھر دیکھو ہے انہیں کا غل — بنگیا ہے زمانہ لال مغل
کافروں نے یہ قہر کام کیا — جوں قزلباش قتل عام کیا
رات سکھ نیند کو جو ترسے ہے — اس کی آنکھوں سے خون برسے ہے
موج دریا کو کردیا خوں ناب — جانور سارے ہو گئے سرخاب
دیکھ ان کھٹملوں کو یوں چالاک — صبح نے بھی کیا گریباں چاک
خوب دیکھو تو فرش سے تا عرش — ہے سقرلات سرخ ہی کا فرش
جتنے ناگوں میں تھے لگے انگور — ان کو ان سب نے کردیا ناسور
زعفرانی تھے کپڑے جنکے پاس — ارغوانی ہوئے انہوں کے لباس
نہیں اس قوم سا کوئی لیچڑ — توشکیں ان سے بنگئیں کیچڑ
جسطرح ہووے آن لگتے ہیں — چارپائی کے کان لگتے ہیں
بہلہ رے کھٹملوں کا تیکھا پن — سارے تکیوں میں انکا ہے مدفن
اور پلنگوں میں جتنے سیرو ہیں — رکھتے اپنا لباس گیرو ہیں
ساری چولوں میں یہ جو گھس آئے — صاف مونگے کے بنگئے پائے

لاکھوں پستے ہیں مارے جاتے ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ پھر وہی رولا کر کے آتے ہیں
کھالیا جو جھپٹ کے کھالوں کو ‌ ‌ ‌ ‌ دھرتے ہیں نام سونے والوں کو
لال لال ان کی کرتیاں دیکھے ‌ ‌ ‌ ‌ سرخ پلٹن کی پھرتیاں دیکھے
بات کچھ کھولتے نہیں ہرگز ‌ ‌ ‌ ‌ منہ سے کچھ بولتے نہیں ہرگز
تو بچارہ نہیں کچھ آپ کے ساتھ ‌ ‌ ‌ ‌ لہو پیتے ہیں پر یہ ہاتھوں ہاتھ
تکیہ ہے یا رضائی یا کہ لحاف ‌ ‌ ‌ ‌ چڑھ گئی سب پہ سرخ ان کی غلاف
پر یہی جانتے ہیں اہل یقیں ‌ ‌ ‌ ‌ ہیں یہ سارے لعین ابن لعین
یا تو یہ ہیں یزید کی اولاد ‌ ‌ ‌ ‌ یا کہ بے شبہ نسل ابن زیاد
جوں جوں مرتے ہیں بڑھتے جاتے ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ اور لوگوں کو توڑ کھاتے ہیں

بس بس انشا یہ چھیڑ تو آ گئے
لوگ سارے ہیں رات کے جاگے

مچھروں کی شکایت

مچھروں کو ہوا ہے اگلے یہ اوج ‌ ‌ ‌ ‌ دب گئی ان سے مرہٹوں کی فوج
ہیں یہ کپڑوں میں صاف گھس آتے ‌ ‌ ‌ ‌ اور مسہری میں بھی سما جاتے

ان کے بہنانے کی ہے یہ آواز ۔۔۔ تار جس سے کبھی نہ ہو دمساز

نیش کر ان کے ریزے ریزے ہیں ۔۔۔ جڑتے بھنکار کر یہ نیزے ہیں

تاک کر ہر طرف سے ہو کے دخیل ۔۔۔ پھونکتے ہیں یہ صور اسرافیل

آندھیاں ان سے کالیاں چلیاں ۔۔۔ بھر گئیں شہر کی گلیاں،

انگوٹھی ڈالئے جو انگلی پر ۔۔۔ پھول آتا ہے صاف ایک نظر

بسکہ لپٹے ہی رہتے ہیں ہر دم ۔۔۔ حبشی ہو گیا ہے اک عالم

لوگ بجلی کی طرح ہیں بیکل ۔۔۔ چھا گئے چھڑوں کے دل بادل

ہر بن مو کی لے چکے ہیں فصد ۔۔۔ اور ہم جانیں کیا ہے ان کا قصد

ارنے اوپلوں کو گو جلا دیجے ۔۔۔ سینکڑوں دھونیاں لگا دیجے

ہیزم تر سے گو کہ نکلے دُود ۔۔۔ کب بھلا بھاگتے ہیں یہ مُردود

آنکھ کے تل میں یہ تو گھستے ہیں ۔۔۔ گوشۂ دل میں یہ تو گھستے ہیں

ہر کسی سے ہے ان کو راز و نیاز ۔۔۔ سب کو دیتے ہیں بل یہ روغن قاز

واہ کچھ زور ہی بچہ ہیں یہ ۔۔۔ یعنی نمرود کے چچا ہیں یہ

آگے کیا کوئی ان کا لکھے بھید ۔۔۔ پڑ گئے کاغذوں میں لاکھوں چھید

آگے مچھر جو چھر دو چار ہوئے ۔۔۔ حرف بے نقطہ نقطہ دار ہوئے

کیوں نہ نوکِ قلم رہے ششدر | گھس گیا اس کی ناک میں مچھر

دانت مچھر کے واں جو اڑنے لگے | جتنے فقرے تھے سب بگڑنے لگے

تھے سیاہی سے لکھے جتنے حرف | مچھروں نے کیا اسے شنجرف

فرق بین السطور کچھ نہ رہا | خطِ مسطر پہ نور کچھ نہ رہا

مارے مچھروں کے یہ ہوئے پیچ پیچ | لگا کاغذ بھی کرنے اب پیچ پیچ

پیش آئے کچھ اس طرح مچھر | نہ رہا امتیاز زیر و زبر

الغرض قوم یہ بہت بد ہے | نام دیکھو تو کیا مشدّد ہے

کھانے پینے میں سب دخیل ہوئے | آگے پشہ تھے اب تو فیل ہوئے

کس نے رکھا ہے ان کا مچھر نام | ان کو کہئے تو کہئے لشکر شام

جب ہوئی شام یہ بھی آ لاگے | آدمی ان سے اب کہاں بھاگے

لفظ انشا نہ بول لا یعنے
مچھر آکر اڑا گئے معنے

سید انشا نے دریائے لطافت زبان فارسی میں لکھی تھی۔ اسکو انجمن ترقی اردو نے بجنسہٖ شایع کر دیا ہے۔ یہ کتاب اردو زبان کی تاریخ۔ علم نحو۔ بیان اور بدیع وغیرہ پر حاوی ہے۔ اس میں

مصنف کا یہ قول انصاف پر مبنی ہے کہ اردو زبان مشتمل است بر چند زبان یعنی عربی و فارسی و ترکی و پنجابی و پوربی و برجی وغیر آن مثال مدلل ۔ واللہ باللہ ۔ تمام شب باجی جان یہی کہتی تھی کہ مجھے چھوٹے بھائی پر بہت تہیا آتا ہے کہ ناحق ناحق تکاجی ساتھ لے کر پابندہ بیگ گھبے کے گھر دوڑ دوڑ کے جاتا ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ اس چھلے کی دوستی میں اپنا سر کٹوا دے ۔ میں نے کہا آپ کا ہے کو کڑھتی ہیں اس لڑکے کا اللہ بیلی ہے ۔ پابندہ بیگ کیا ہے ۔

اس عبارت میں لفظ گھبا اور بیلی پنجابی ہیں ۔ یہ سید انشا کی وسعتِ طبع اور نیک نیتی کی علامت ہے کہ اس نے زبان پنجابی کو اردو کا ایک رکن قرار دیا ہے ورنہ تذکرہ آب حیات میں جہاں کہیں تاریخ زبان اردو کے تعلق سے کوئی پنجابی لفظ درمیانِ بحث آگیا ہے ۔ آزاد نے اسکو ٹکسال باہر قیاس کیا ہے ۔ اور پنجابی کو بالکل ایک علٰحدہ زبان قرار دیا ہے ۔ لیکن سید موصوف نے کتاب دریائے لطافت کے خاتمے میں بھی پھر اسی بحث کو چھیڑا ہے ۔ اور لکھا ہے ۔ کہ ہر لفظے کہ در اردو مشہور شد عربی باشد یا فارسی یا ترکی یا سریانی

یا پنجابی یا پوربی از روئے اصل غلط باشد یا صحیح آں لفظ۔ لفظ اردو است
اگر اسی اصول کے مطابق اہل زبان کچھ عمل در آمد کرتے تو شاید
آج اردو کا رکنِ اعظم پنجابی ہوتی۔ کیونکہ ابتدا میں جب ہند مسلم قومیں
ملک پنجاب میں باہم معاشرت ہوئی تھیں تو یہ زبان جانشینانِ
سلطان محمود کے عہد میں یہاں اختراع کی گئی تھی۔ قریباً دو سو برس
صرف بول چال میں استعمال ہوتی رہی اور وہ بصورت پنجابی تھی۔
پھر جب مسلمان فاتحین پنجاب سے کچھ آگے بڑھے اور ان کی سلطنت
دلی و دکن تک وسیع ہوتی چلی گئی تو خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں
یہ زبان لکھنے پڑھنے میں آئی۔ اور پھر اس میں ایسی کچھ اصلاحیں
اور تغیر و تبدل کئے گئے۔ کہ اردو و پنجابی زبان میں بہت فرق
پیدا ہوگیا۔ ورنہ بقول سید انشاء زبان پنجابی بھی ادب اردو کا
ایک خاص جزو ہے اور میرے نزدیک تو اردو کی اماں یہی پنجابی
زبان تصور کیجائے تو اس میں از روئے تاریخ کوئی عیب کی بات
ہرگز دکھائی نہیں دیتی۔ اور نہ اس سے اردو کی شان میں کچھ
بٹہ لگتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز کی اصل اس کی ظاہریت سے عموماً مختلف

ہوا کرتی ہے۔ جیسے کہ انگریز اور شمالی ہندوستان کے ہندو ایک ہی آریہ نسل سے ہیں۔ مگر اب دونوں میں معاشرت اور مذہب کے لحاظ سے کوئی مناسبت ہی باقی نہیں رہی۔ ہندو کجا اور انگریز کجا ؟

سعادت یار خاں رنگین

وفات سنہ ۱۲۵۱ھ

فارسی علم ادب میں سوزنی نے اپنی فحش ہجویں لکھکر بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اور ابو اسحٰق اطعمہ نے اپنے کلام میں خور و نوش کے مضامین کے سوا اور کچھ لکھا ہی نہیں تھا۔ اور اپنے دیوان کو جس میں خواجہ حافظ کے متصوفانہ کلام کی عموماً تخریب کی گئی تھی تکثیر الاشتہا کے نام سے شائع کیا تھا۔ چونکہ اس قسم کے یک فنی خاص موضوع کے جدت طراز شاعر باوجود اپنی عامیانہ قابلیت کے اچھے اچھے شاعروں سے بھی زیادہ اپنے ملک اور قوم میں کامیاب رہتے ہیں اس لئے میں ان شعرا کو سوسائٹی کی عام تفریح اور تفنن طبع کی خاطر بہت ضروری خیال کرتا ہوں۔ اور کم از کم پریشان گوئی یا عشقیہ غزل

خوانی کے بے سود مشغلے پر تو ہر طرح فوقیت دیتا ہوں۔ پس اسی خیال سے میرے نزدیک سعادت یار خاں رنگین جو صاحب ایجاد تھا اور باقی سب شعراسے الگ اسنے بالمقابل ریختہ ۱۱۹۰ھ ہجری کے قریب ریختی لکھنا شروع کیا تھا اسکو نہایت قابل وقعت سمجھتا ہوں۔ رنگین کی دیکھا دیکھی سید انشا نے بھی جو بقول آزاد اسکا دستار بدل بھائی تھا، ریختی نظمیں لکھی تھیں۔ مگر وہ رنگین کے کلام کو ہر گز نہیں پہنچ سکیں۔ کیونکہ ان میں زبان کی گھلاوٹ اور وہ لوچ نہیں ہے۔ جو رنگین کے ریختی کلام سے مخصوص ہے۔

تصنیفاتِ رنگین

رنگین کے چار دیوان ہیں۔ جنکا مجموعہ نورتن کہلاتا ہے۔ پہلے دیوان کا نام ریختہ ہے دوسرے کا بیختہ تیسرے کا آمیختہ جس میں شاید سب سے پہلے ریختہ یعنی مردوں کے عشقیہ جذبات کے ساتھ عورتوں کے عشقیہ خیالات بھی درج کئے ہیں۔ اور اس کا عنوان اس شعر سے کیا ہے ؎

لعنت ہیں کوئی شریک نہیں تیرا دوسرا

جتنے ہیں رنڈی باز تو سب کا ہے پیشوا

اسی طرح رنگین کے چوتھے دیوان کا نام ریختی ہے اور یہ کلیم عورتوں ہی کے حسن و عشق کے خیالات سے لبریز ہے مثلاً ؎

داری تیرے جاؤں میں خالق ہے تو خلقت کا

چونکہ ریختہ کی مؤنث ریختی ہے۔ رنگین کے اسی دیوان ریختی سے اس زنانہ شاعری کا آغاز ہوا۔ ہم سب جانتے ہیں۔ کہ جب کوئی بات نئی ایجاد ہوتی ہے۔ تو موجد پر بڑی لے دے ہوتی ہے۔ اور اکثر آوازے کسے جاتے ہیں۔ لیکن ایک صاحبِ ہمت شاعر کو اگر وہ کسی خاص قسم کی شاعری کا واضع یا بانی ہو۔ تو کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ جیسے کہ سید انشا دریائے لطافت میں لکھتے ہیں کہ ایک بڈھے شاعر کی زبانی جو میر صاحب کہلاتے ہیں۔ یہ گفتگو رنگین کی نسبت سننے میں آئی تھی۔ اس گفتگو میں مخاطب پر استہزا و تمسخر کیا گیا ہے " ایک اور سنیئے سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپکو جانتا ہے۔

اور رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے کہ نام اسکا دلپذیر ہے۔
رنڈیوں کی بولی اس میں باندہی ہے۔ اور میر حسن پر زہر کھایا ہے۔
وغیرہ وغیرہ۔ ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اور
اس میں یوں لکھتا ہے ؎

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو | یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

(ملاحظہ ہو آبحیات صفحہ ۱۰۱)

یہ ساری غزل سعادت یار خاں کی ریختی گوئی کو بطور نمونہ پیش کرنے کے لئے درج ذیل کی جاتی ہے ؎

غزل

جو ہونی تھی سو بات ہولی کہارو	چلو لیچلو میری ڈولی کہارو
یہ چھپر چاؤ رستے سے مرجاؤ سارے	لگے تم کو ایسی ہی گولی کہارو
چلو ہولی ہولی دھمک سی نہ نکلے	گئی سب مسک میری چولی کہارو
میرے مغز کے بس اڑاؤ نہ کیڑے،	سناؤ نہ اپنی یہ بولی کہارو
الٰہی کرٹی نکلے تالو میں گلٹی،	یہ جیسے زباں تم نے کھولی کہارو
جو ہیں اتری ڈولی سی میں تم نے وہی	پٹاری میری سب ٹٹولی کہارو

۱ کم بخت

علی کی قسم میں نہ دونگی کہاری مجھے سمجھیو تم نہ بھولی کہاری

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو

کہ یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

اشعارِ رنگیں

آخری ہے چہار شنبہ چل دوا وہاں جس جگہ

مٹکتا سا باغ ہو اور ننھی ننھی کیاریاں

اب تو بکی ہو گئی ہوں جن دنوں چھوٹی تھی میں

ان دنوں تھی بھولی بھولی میری باتیں پیاریاں

میری سوکن کی کبھی نکسیر بھی پھوٹی نہیں

ٹکریں لاکھوں ہیں درگاہوں میں میں نے ماریاں

کیا بری خو ہے تری دائی کہ کھا کر پان کو

مارتی ہے منہ سے تو دیواروں پر پچکاریاں

جھاڑ و جھٹکو گھر کی آرائش کرواے باندیو

آج ہیں رنگیں کے آنے کی یہاں تیاریاں

ولہ

یہ خواہش ہے میری تو مرجائے آتوں

سنانی تیری یہاں سے گھر جائے آتوں

نہیں ہلنے دیتی یہ تاکوئی ہے ہے

ترے ہاتھ سے اب کدھر جائے آتوں

کوئی خوب سی پیس کرڈالے مرچیں

ترے دونو دیدے میں بھر جائے آتوں

دعا ہے یہ بندی کی ونرات جی سے

الٰہی جہاں سے گذر جائے آتوں

میرے جی میں ہے آج گڑیاں نکالوں

سویرے سے گراپنے گھر جائے آتوں

کہا تھا نہ مجھے کل تجھے دونگی چھٹی

کروں کیا جواب تو مکر جائے آتوں

نہیں چڑھنے دیتی ہے کوٹھے پہ مجھکو

چڑھوں میں اگر اپنے گھر جائے آتوں

جو کہا میں بھیجوں تو پھر تجھکو رنگیں
ابھی آنکر ذبح کر جائے آ تون،

رنگین کی طرح جان صاحب نے بھی ریختی لکھی ہے۔ مگر وہ زیادہ تر فحش اور تہذیب سے بعید ہے۔ اسی طرح نظم اردو کے اعجوبہ گویوں میں چرکیں لکھنوی کا ایک گوہ اور موت کے مضامین سے لبریز مگر ضخیم دیوان میں نے لکھنؤ میں دیکھا تھا مگر یہاں اس سے سروکار نہیں۔ تذکرہ گلستان سخن میں اسکا حال مندرج ہے۔ ہدہد اور زاغ کے معرکے اور مجادلے بھی اسی قماش کی ایک شاعری ہے جسکا تذکرہ آبحیات میں بالتفصیل مذکور ہے۔ رنگین نے ۱۲۵۱ھ میں اسی سال کی عمر پاکر وفات پائی تھی۔ اسکی ایک تصنیف مجالس رنگین نثر میں بھی ہے۔ جس میں سب شعرا کے کلام اور ان کے حالات پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ اس نے فرسنامہ رنگین نامی گھوڑوں کے علاج وغیرہ کے متعلق بھی ایک نظم تصنیف کی تھی۔ اور اسکی دو مثنویاں ایجاد رنگین اور دلپذیر وغیرہ بھی ہیں۔ مثنوی

دلپذیر کے متعلق جرأت نے یہ تاریخ لکھی تھی ؎

ہے یہ بدر منیر سے بہتر

جس سے سال ۱۲۱۲ھ ہجری برآمد ہوتا ہے۔ ایجاد رنگین میں مختلف اخلاقی کہانیاں ہیں مثلاً حکایت کژدم ؎

ایک نے بچھو سے یہ کی گفتگو
ڈنک بے تقصیر کیوں مارے ہے تو
سنکے بچھو نے کہا ناداں ہو تم
ہے یہ سیدھی بات کیوں حیراں ہو تم
تم نہیں سمجھے ہو اس کو کیا ہے یہ
مقتضا میری طبیعت کا ہے یہ
حق ہے رنگیں جس کی جو خلقت میں ہے
اسکی بس لازم وہی نیت میں ہے

شیخ ناسخ

وفات ۱۸۳۸ء

سخنوران دہلی کی متابعت سے آزاد ہو کر لکھنؤ کی پُرشان وشوکت نازک خیال اور بلند پرواز شاعری کی ابتدا شیخ ناسخ سے ہوئی تھی۔ اس لئے وہ بھی ایک صاحب ایجاد اور بقول غالب پرانی روشوں کے ناسخ ہیں۔ ان کا اصلی وطن لاہور یا پنجاب تھا۔ مگر انہوں نے لکھنؤ

ہی میں نشو و نما حاصل کیا تھا۔شاعری حقیقت میں قافیہ پیمائی نہیں ہے۔بلکہ استعارہ و تشبیہ وغیرہ کے زور سے ایک معمولی سی بات کو لطیف اور خوشگوار بنا دیتا ہے۔اور یہ بات ناسخ کے کلام میں ہر جگہ واضح پائی جاتی ہے۔مثلاً ؎

چوٹ دل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو
صدمہ شیشے کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

شعرا دل کو ہمیشہ آئینۂ دل کہتے یا اسکو شیشہ سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔مگر اسی پا افتادہ استعارہ سے ناسخ نے کیسا نازک خیال وضع کیا ہے کہ دل کے آئینہ نے چوٹ کھا کر صدا دی۔ ناسخ کی وہ غزلیں جو آتش کی غزلوں کے ہم طرح ہیں۔سب کی سب مطالعہ کے لائق ہیں۔چنانچہ مرزا مہدی حسن آبادنے ایک مجموعہ نظم بنام بہارستانِ سخن شایع کیا تھا جس میں اسنے اپنے استاد ناسخ اور خواجہ آتش کی غزلوں کے ساتھ اپنی ہم طرح غزلیں بھی سب درج کر دی تھیں۔ لہٰذا آتش اور ناسخ کا کلام جسقدر اس مجموعہ میں شامل ہے۔وہی شائقین شعر کو ایک نظر

دیکھ لینا کافی ہے۔ کیونکہ اسی ایک تصنیف سے کلام میں نازک خیالی اور استعارہ وتشبیہ کے استعمال کا سلیقہ بخوبی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

ناسخ نے ایک مثنوی بنام نظم سراج بھی لکھی تھی۔ جس میں خدا کی شانِ کبریائی کا اظہار اور احادیث کا نظم میں خلاصہ و ترجمہ کیا تھا۔ مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بجز غزل کے اور کسی صنفِ سخن پر قادر نہیں ہو سکے۔ اس لیے اس مثنوی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ علاوہ مثنوی کے شیخ ناسخ کو قصیدہ و رباعی میں بھی کچھ دستگاہ حاصل نہیں ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ناسخ اور آتش کی نسبت عام طور سے یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ آتش بالکل سادہ لکھنے والے تھے۔ اور اس کے برعکس ناسخ ہمیشہ رنگینی اور نازک خیالی سے کام لیا کرتے تھے۔ لیکن وہ ہم طرح غزلیں جو بہارستانِ سخن میں ان دونوں شاعروں کی منتخب ہو کر درج ہوئی ہیں۔ ان کو دیکھکر یہ رائے کچھ بدل دینی پڑتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ اگرچہ شیخ ناسخ خواجہ صاحب سے زیادہ ثقیل۔

پرشوکت اور مشکل الفاظ غزل میں برتا کرتے تھے۔ مگر خیالات کی رنگینی بوجہ لکھنؤ کی رہائش کے دونوں شاعروں میں یکساں پائی جاتی ہے۔ جس کی توضیح آتش کے تذکرہ میں آیندہ کی جائیگی۔

انتخاب کلام ناسخ

شیخ ناسخ نے لکھنؤ کی تعریف میں دو ایک غزلیں بہت اچھی لکھی ہیں۔ اس بیاض کے لئے ان میں سے ایک غزل یہاں درج ہوتی ہے ۔

غزلِ ناسخ

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ!
لکھنؤ مجھ پر فدا ہے میں فدائے لکھنؤ!
تو نے دیکھی ہیں کہاں رنگیں ادائے لکھنؤ!
لالہ و گل کے چمن ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ!
پچھم اور اوتر کے کونے سے چلی آتی ہے روز
بوئے زلفِ یار لے لے کر ہوائے لکھنؤ!

دشتِ غربت میں نظر آتی ہے جب مہماں سرا
یاد آتی ہے مجھے عشرت سرائے لکھنؤ
بادشاہِ لکھنؤ کی ہو بیاں کس سے شکوہ
ہاتھ میں رکھتے ہیں جامِ جم گدائے لکھنؤ
تلخ اس دم مجھکو اپنی جانِ شیریں ہو گئی
یاد جب آیا کوئی شیریں ادائے لکھنؤ
کب ہوا ہے ساکن و مسکن میں ایسا ارتباط
مَیں نہ جاؤں تو مرے پاس آپ آئے لکھنؤ

اسی غزل کے ہم طرح رجب علی بیگ سرور نے بھی فسانۂ عجائب میں لکھنؤ کی تعریف میں ایک نظم لکھی ہے جو ناسخ کی اس غزل سے ہرگز کم نہیں ہے۔ اس لئے وہ بھی یہاں نقل ہوتی ہے ؎

تا ابد قائم رہے فرمانروائے لکھنؤ
یہ نصیر الدین حیدر پادشاہِ لکھنؤ
گو ملے جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ

چونکہ اٹھتا ہوں میں ہر دم کہہ کے ہائے لکھنؤ
رشک کھا کھا گو فلک مجھ سے چھڑائے لکھنؤ

تب میں جانوں دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ
یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوا یہ انقلاب

پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ
اُن کے استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک

جام جم پر لُطف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ
کیوں گمانِ زاغ بلبل کے ترانے پر نہ ہو

یاد آجائیں جو وہ نغمہ سرائے لکھنؤ
ہر محلّے سے بچا ناجی ہے یعلے اکو محال

چھوڑتے جیتا نہیں معجز نمائے لکھنؤ
دشتِ غربت میں کیا برباد وحشت نے تو کیا

دل سے جاتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ
یہ رہے آباد یارب! تا بدورِ مشتری

میں کہیں ہوں مانگتا ہوں پر دعائے لکھنؤ

بلبلِ شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اس نے کیئے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

خواجہ حیدر علی آتش

(وفات ۱۸۴۷ء)

ولی کا دیوان دکن سے سنہ محمد شاہی میں دلی پہنچا تو اسوقت شعرائے اردو کے دو جتھے دلی میں قائم ہو چکے تھے۔ ایک کے سربراہ شاہ حاتم تھے۔ کہ جنکے شاگرد سودا اور سعادت یار خاں رنگین وغیرہ تھے۔ اور ....

.. دوسرے گروہ کے رہنما سراج الدین علیخاں آرزو اور شاہ گلشن ہدایت تھے۔ ان کے شاگردوں میں مظہر جانجاناں۔ میر تقی اور درد وغیرہ تھے۔ اوّل الذکر مجمع میں حاتم۔ سودا اور رنگین تو سپاہی پیشہ اور ایسے اجنبی شاعر تھے کہ جن کے خاندان عموماً باہر سے آکر دلی میں آباد ہو گئے تھے۔ اور یہ شاعر خود بھی کبھی جم کر دلی میں نہیں رہے تھے۔ اسلیئے انکی شاعری

گویا ایک غیر معلوم کی شاعری تھی۔ جو اکثر فارسی زبان کے تراجم اور استفادہ سے مالا مال ہوتی تھی۔ ان میں سب سے پہلے حاتم نے اس کی ابتدا کی۔ حالانکہ ولی خود ۱۱۱۲ھ ہجری میں جب شاہ ابوالمعالی کے ساتھ دلی آیا تھا۔ تو شاہ گلشن ہدایت سے (جو اس دوسرے جتھے کے رکن اعظم تھے) ریختہ گوئی کا ڈھنگ سیکھکر دلی سے دکن چلا گیا تھا۔ لہذا دلی کی حقیقی اور اصلی شاعری خان آرزو و میر تقی مظہر جانجاناں اور درد کی حسن و عشق کے جذبات سے لبریز شعر گوئی ہے۔ جب دلی بگڑ گئی تو زیادہ تر خارجی شاعر سب سے پہلے دلی چھوڑ کر لکھنؤ اور فیض آباد وغیرہ پر امن علاقہ جات اودھ میں مقیم ہوئے۔ ان میں میرزا رفیع الدین سودا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جنکی نسبت میرا خیال ہے کہ شیخ ناسخ نے اپنی شعر گوئی میں شعرائے فارسی کا تتبع کرتے ہوئے شوکت الفاظ کا جسقدر استعمال بکثرت کیا ہے وہ حضرت سودا ہی کی گویا تقلید کا نتیجہ ہے۔ لیکن دلی کے اُس خاص ملکی گروہ میں سے جو اس شہر کے اردو شعرا کا دوسرا جتھا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میر تقی حضرت سوداؔ کی وفات کے بعد لکھنؤ پہنچے (یعنی سوداؔ نے ۱۱۹۵ھ ہجری میں انتقال کیا - اور میر صاحب ۱۱۹۷ھ ہجری لکھنؤ چلے گئے - بقول مصنف گلشن ہند) تو آتش نے سوداؔ کی بجائے زیادہ تر میر تقی اور ایسے ایسے شعرائے دلّی کی تقلید کی کہ جو میر سے بھی کچھ پہلے دلی کی خاص زبان کو لکھنؤ میں شہرت دلا چکے تھے - اور جس میں دلّی کے خارجی شعرا کی تغزّل کا رنگ شامل نہ تھا - اس لئے آتش کی زبان گویا دلی کی خاص زبان سے مستفاد ہوئی ہے - اور اس میں سادگی خیال اور محاورہ زبان کے ساتھ شدت تاثیر اور جذبات کے منتقل کرنے کی بھی قوت موجود ہے - لیکن یہ کہنا کہ وہ بالکل ہی سادہ گو تھا - کسی قدر غلط ہے کیونکہ اگر سادگی مراد لیجائے - اور یہ کہا جائے - کہ جسقدر عربی فارسی الفاظ نظم میں کم لائے جائیں وہی زبان سادہ ہوتی ہے - تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جسقدر ملک کے خاص خاص محاورات اور لغات بکثرت مستعمل ہوں - وہی کلام سادہ سمجھا جائیگا - تو یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ میر تقی سے زیادہ اور کسی شاعر نے دلی

کی خاص وطنی زبان اور محاورات کو استعمال نہیں کیا ہے۔ مگر
اس پر بھی اسکا کلام مجموعی طور پر اپنے اکثر ہمعصروں مثلاً میر درد
مظہر جانجاناں اور خان آرزو وغیرہ کے کلام سے رنگین مانا
گیا ہے۔ یہی حال خواجہ آتش کا ہے۔ کہ اگر اسکا کلام ناسخ
کے بجائے۔ انشاء اللہ خاں۔ انشا۔ جرأت اور مصحفی وغیرہ ہمعصر
شعرائے لکھنؤ کے کلام سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ تو اس کے
صوفیانہ خیالات عموماً زیادہ پر تکلف۔ عمیق اور دور رس معلوم
ہوتے ہیں۔ اگرچہ الفاظ میں اسقدر شوکت اور ثقالت یا رنگ
آمیزی نہیں پائی جاتی۔ تاہم اردو زبان جسقدر فارسی لغت سے
بلاتکلف وآورد استفادہ کر سکتی ہے۔ وہ خواجہ صاحب
کی تصنیف کا اصلی جوہر ہے۔ اور بہارستان سخن میں انکی جتنی
غزلیں ناسخ کی غزلوں کے ہمطرح درج ہوئی ہیں۔ اُن میں
آتش کا کلام فارسی ترکیبوں اور فارسی الفاظ و محاورات کی
شمولیت سے اسیطرح مستفاد معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کہ ناسخ
کا۔ حاصل یہ کہ آتش کا کلام ایسا سادہ اور رنگینی سے معرا نہیں

ہے ۔جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے ۔اب اسکی مزید توضیح سطور ذیل میں کی جاتی ہے ۔

شعر میں سادگی سے کیا مراد ہے ؟

مصحفی کا کلام غالباً سب لکھنوی شعرا سے زیادہ سادہ ہے ۔ اسی طرح دلّی کے شاعروں میں ظفر کا کلیات اول سے آخر تک صاف اور سادہ ہے ۔ مگر مصحفی کی غزلوں میں ہمواری نہیں پائی جاتی کیونکہ بعض اشعار حد درجے کے فصیح و بلیغ واقع ہوئے ہیں ۔اور بعض شعر غزل میں ایسے پھُس پھُسے ہیں ۔ کہ پھیکے شربت کا مزہ آتا ہے ۔مثلاً نگاہ لطف کے کرتے ہی رنگ انجمن بگڑا

محبّت میں تری ہم سے ہر اک اہل وطن بگڑا

یہ جس غزل کا مقطع ہے ۔ اسی میں کا ایک شعر ہے سے

سوئی جس کو لگائی زید کی معشوقہ نے اپنی

سبھی سنورے وہی مجنوں کا بس اک پیرہن بگڑا

اس کو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مطلع کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں ہے ۔پس مصحفی کا کلام گو سادہ ہے ۔مگر اسمیں

ہمواری نہیں ہے اور جہاں ہمواری نہ ہو۔ وہ کلام کبھی سادہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن آتش نے باوجود سادگی زبان کے رنگین محاوروں اور استعاروں وغیرہ کے زور سے اپنے کلام کو اس قدر بلیغ اور مرصّع کیا ہے۔ کہ اس کی سادگی بھی دوسرے شعرا کی رنگینی کو اکثر مات کر دیتی ہے۔ مثلاً اسی زبان میں آتش کی غزل کا مشہور مطلع ہے۔ ؎

فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

(یہ ساری غزل آب حیات میں معہ مصحفی کی غزلوں کے مندرج ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں)

اس مطلع میں چلن بگڑا اور خدا کی یاد بھولا۔ اہل زبان کے خاص محاورے اور روزمرہ دہلی کی بول چال کے عین مطابق ہیں۔ لہذا یہ شعر علو خیال میں ناسخ کے اس رنگین شعر سے بھی زیادہ پر تاثیر اور ناخن بر جگر ہے ؎

بگڑ جاتا ہے سیب پختہ گردش روز رکھنے میں

تماشا ہے کہ برسوں میں نہ وہ سیب ذقن بگڑا

شیخ ناسخ نے اس شعر میں جمہور شعرا کے خلاف سیب ذقن اور سیب خوردنی میں فی الحقیقت جو فرق پایا جاتا ہے۔ اسکو واضح کرنا چاہا ہے۔ مگر غیر فصیح الفاظ کے سبب اس کی تمام رنگین خیالی ایک گلے سڑے سیب سے کچھ زیادہ مزہ نہیں دیتی۔

اسی زمین اور قوافی میں مصحفی نے متعدد غزلیں لکھی تھیں اور جب آتش سے اسپر بگاڑ ہو گیا تو لکھا کہ ؎

ہمیں تکلیف نظم شعر کے دینے سے کیا حاصل

زمانہ ہم سے ان روزوں ہی یاران وطن بگڑا

یا ممکن ہے یہ غزل کسی نے بہ فرمائش مصحفی سے لکھوائی ہو۔ مگر مصحفی کا یہ شعر ؎

ہمیشہ شعر کہنا کام تھا والا نژادوں کا

صفیہوں نے دیا ہی دخل جب سی لس تو فن بگڑا

اصلیت کو واضح کر دیتا ہے۔ ممکن ہے یہی شعر خواجہ صاحب کو کھٹک گیا ہو اور وہ مصحفی سے الگ ہو گئے ہوں کیونکہ وہ بھی

ان دنوں میں آزادانہ رندمشرب صورت بنائے ہوئے زندگی بسر کیا کرتے تھے جو شرفائے لکھنؤ کی قطع وضع سے کچھ مختلف تھی۔ جب ان غزلوں اور ان کے متعلق اُستاد و شاگرد کے معرکوں کا چرچا بہت دور تک پھیل گیا تو کسی دوست نے ناسخ سے بھی اسی زمین میں غزل کہنے کی فرمائش کی تھی مگر آتش کی غزل سب سے اچھی رہی۔ لہٰذا شیخ ناسخ نے اپنے قطعے میں یہ اشارہ کر دیا تھا۔

غزل لکھوائی ہے مجھ سے بہ جبرا ایک صاحب نے
نہیں اسمیں قصور اصلا جو انداز سخن بگڑا[1]

غرض شعرائے دہلی میں میر تقی میر اور شعرائے لکھنؤ میں میر کے مقلد آتش کا رنگ سب سے اچھا رہا ہے۔ بلکہ میرزا غالب نے بھی جو کسی اور ہندوستانی شاعر کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ مگر ہاں کمال سخن کے خواہ وہ کسی میں ہو ضرور معترف ہوتے تھے۔ آتش کی نسبت چوہدری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھا تھا کہ شیخ ناسخ کے ہاں نشتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ

[1] پوری غزل بہارستان سخن میں ہے۔

تیز نشتر ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے شعروں کی کچھ مثالیں بھی مرزا صاحب نے قلمبند کی ہیں۔ مثلاً میر تقی ؎

بد نام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو
رکھیگا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا ؎ دکھلائیے لیجا کے اسے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم ؎ قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیونکر مانوں
ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن خاں ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ ستر و بہتر نشتر اسی صورت کلام میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ کہ فارسیت یا غیر زبان کے اشعار سے زیادہ مواد اردو غزل میں ٹھونسنے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ خواجہ آتش جیسے ادب فارسی یا عربی زبان کے متبحر نہ تھے۔ ویسے ہی ان کے

لہ بحوالہ اردوئے معلیٰ۔

اردو دیوان میں بھی اردو کا رنگ خالص لکھنوی یا دہلوی ہے۔
اور ہر شعر تیر و نشتر کا کام دیتا ہے۔ لہذا آجکل فارسی کی معمولی درسی
کتابیں یعنی گلستاں۔ بوستاں۔ دیوان حافظ۔ سکندر نامہ اور ایک
آدھ نازک خیال فارسی شاعر مثلاً صائب۔ جلال۔ اسیر۔ ظہوری
یا شیخ علی حزین وغیرہ کا دیوان پڑھکر میدان شاعری میں قدم رکھا
جائے۔ اور زیادہ تر شعرائے اردو (جدید و قدیم) ہی کا کلام زیر غور
و مطالعہ رہے۔ تو بس ضروریات شاعری کے لئے کافی و وافی ہوگا۔

دور حاضر میں اکثر شعرا مثلاً اقبال وغیرہ غالب کی پیروی کرتے ہیں
مگر مرزا غالب خود آتش کے مداح تھے۔ جیسے کہ لکھا جا چکا ہے۔
اسی طرح سب سے زیادہ رنگین خیال شعرا اور وہ بھی لکھنؤ کے۔
خواجہ صاحب ہی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ مثلاً رند۔ صبا
وزیر۔ نسیم لکھنوی۔ گویا۔ اور خلیل وغیرہ جو کہ بقول آزاد بظاہر آتش
کے شاگرد تھے۔ مگر اسی شاگردی میں رتبۂ استادی تک پہنچ گئے تھے

اب یہاں خواجہ صاحب کے سہل ممتنع اشعار یا ان کے تیز
نشتروں کی کچھ مثالیں ان کے کلیات سے ماخوذ ہو کر نقل ہوتی ہیں

انتخاب کلام آتش

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو !
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا ،

ایک شعر ؎

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند دم میں
قیمت جو دو عالم کی ہے بعانہ ہے اسکا

یہ شعر فارسی کے اس شعر سے ترجمہ نہیں بلکہ استفادہ کر کے تصنیف ہوا ہے ؎

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتہ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

سودا بھی کہتے ہیں ؎

دکھلائیے لیجا کے اسے مصر کا بازار
خواہاں نہیں پر کوئی یہاں جنسِ گراں کا

گویا یہ خیال اردو میں بارہا آچکا تھا۔ اسی لئے خواجہ صاحب نے بھی اس کو نظم کر دیا ؎

محبّت کا تری بندہ ہر اک کو اے صنم پایا

برابر گردنِ شاہ و گدا دونوں کو خم پایا،

اے ہما پیشِ فقیری سلطنت کیا مال ہے،
پادشاہ آتے ہیں پابوسِ گدا کیواسطے

سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں
غنیمت جان اگر آرام تو نے کوئی دم پایا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

خدا اسر دے تو سودا دے تیری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

نہ تم بیزار ہو ہم سے نہ ہم بیزار ہوں تم سے
محبت کا مزہ کیا ہے جب آیا درمیاں کھٹکا

دل بھر کے سیر کی نہ خراباتِ دہر کی
سیلاب کی طرح سے ہم آج آئے کل چلے

خواجہ آتش کے یہ اشعار رسالۂ چراغِ سخن کے لئے جناب یاس نے منتخب کئے تھے۔ وہ خواجہ صاحب کے بڑے مدّاح اور

اپنے آپ کو اکثر خاکپائے آتش لکھا کرتے ہیں۔ فی الواقع آتش کی شاعری اسی قابل ہے کہ شعرائے پنجاب اسکی جسقدر ممکن ہو پیروی کریں۔ اور آتش کے بعد رند۔ صبا۔ وزیر۔ گویا اور خلیل سے بھی مستفاد ہوں۔ تو پھر اور کسی اردو شاعر کے مطالعہ ہی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ البتہ آتش کیساتھ حالی کی سادگی گویا سونے پر سہاگہ سمجھنا چاہئیے

فقر و فاقہ

مولنا آزاد نے آبِ حیات میں خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی کا جو فوٹو دکھایا ہے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت تنگدست۔ مفلس اور ٹکر گدا تھے۔ جو ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں راکھ کا ٹھیکرا سامنے رکھے ہوئے۔ لنگ باندھے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ خلیل صاحب کی بی بی پکا پکایا کھانا بھیجدیتی تھیں۔ سید محمد خاں رند اور گویا صرف ۲۵ - ۳۰ روپیہ ماہوار کی مالی مدد بہم پہنچاتے تھے۔ مگر یہ قول صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ایک ایسے نغز گو شاعر کے لئے اطمینانِ قلب نہایت لازم و لابد ہے۔ حالانکہ فقر و فاقہ کی حالت میں انسان سے

کوئی کام کبھی ٹھیک بن نہیں پڑتا۔
ایکدن ہم اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ خمخانۂ جاوید جلد اول میں خواجہ صاحب موصوف کے متعلق یہ فقرہ ہماری نظر سے گذرا کہ خواجہ صاحب اگرچہ کسی کے ملازم نہیں تھے۔ مگر پھر بھی سرکار لکھنؤ سے ۸۰ روپے ماہوار انکو بطور وظیفہ کے ملتے تھے۔
لہذا اس قدیم زمانہ میں اتنی بڑی رقم کے ساتھ تمام شاگردوں کی نذر و نیاز بھی جمع کرو تو خواجہ صاحب کو مفلس اور بالکل قلاش آدمی ہرگز نہیں مانا جاسکتا۔ ہاں اگر تکیہ نشینی اور

قرار ندد کفِ آزادگاں نگیرد مال

کا سا معاملہ تھا تو وہ بات دوسری ہے۔
بعض انگریزی تذکروں میں لکھا ہے کہ حضرت آتش فارسی غزلیں بھی کہتے تھے۔ مگر اسکا کوئی اثر آثار ہمارے ہاں نہیں پایا جاتا۔
اگرچہ آتش کی آتش بیانی ہمیشہ غزلوں کی صورت میں سوز و گداز پیدا کیا کرتی تھی۔ مگر انہوں نے ایک قطعہ بھی اپنے کلام میں ایسا لاجواب لکھا ہے جو باوجودیکہ عشقیہ ہے۔ مگر اس میں نشاط جوانی

کی پوری تصویر اتر آئی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
نکلتے تھے دو چاند اس سے مقابل
وہ شب صبح جنت کا جس پر گماں تھا
عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل
فرحناک تھی روح دل شادماں تھا
مشاہد جمال پری کی تھی آنکھیں
مکان وصال اک طلسمی مکاں تھا
حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی
کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا

کیا تھا اُسے بوسہ بازی نے پیدا
کمر کی طرح سے جو غائب وہاں تھا

حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا آتش جواں تھا

آتش نے بھی شعرائے فارسی سے استفادہ کیا ہے مثلاً نظیری کہتے ہے

مجلس چو در شکست تماشا نظارہ رسید
در بزم چوں نماند کسے جا بما رسید

آتش سے

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

شعرائے دہلی سے سخنورانِ لکھنؤ کا انحراف

سنہ ۱۸۰۱ میں جبکہ تذکرہ گلشن ہند لکھا جا چکا۔ ناسخ کی عمر ۲۸ سال کی تھی۔ اور آتش کی ۳۴ سال کی۔ اور وہ دونوں خوب ہی کہتے تھے

مگر ابھی تک لکھنؤ میں قدیم شعرائے دہلی کا رنگ جما ہوا تھا۔ اس لئے ان کا کوئی قدرداں ہی نہ تھا۔ لہذا تذکرہ مذکور میں ان دونوں کا نام نہیں پایا جاتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اہل دہلی یا ان کے حمایتی شعرا اسوقت تک لکھنویوں کو کچھ خیال میں بھی نہیں لاتے تھے۔ لیکن پھر آتش اور ناسخ اسٹیج پر آئے۔ تو یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۱۱ء میں مصحفی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور ۱۸۱۸ء میں میر انشاء اللہ بھی وفات پا چکے تھے۔

پس اسی سن و سال سے شعرائے لکھنؤ کی قدر ہونے لگی۔ اور اسقدر عزت و توقیر ہوئی کہ وہ شعرائے دہلی اور ان کے تتبع کے بھی خواہاں نہ رہے اور خود اپنی لکھنوی طرز میں غزل کے لئے خاص ... زمینیں ایجاد کر کے شعر کہنے لگے۔ اور ایسا اچھا کہا کہ شوخی اور رنگینی کلام میں لکھنؤ۔ دہلی سے کبھی دوسرے درجے پر نہیں رہا۔ خصوصاً مصرعہ لگانے میں (یعنی ایک شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے کہنا اور پھر اسپر پہلا مصرعہ لگانا) آتش کی نظیر نہیں ملتی۔ اسی سے اہل لکھنؤ کے کلام میں وہ ہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ کہ رند، وزیر، صبا وغیرہ سب کا کلام بالکل مربوط اور ہمیشہ یکساں نظر آتا ہے۔

بحوالۂ شرح دیوان غالب طباطبائی صفحہ ۱۸۵

شیخ ابراہیم ذوقؔ

وفات ۱۸۵۵ء

میرزا سوداؔ کی طرح ذوقؔ کی طبیعت بھی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی۔ چنانچہ عالم شباب میں کبھی وہ سوداؔ اور کبھی جراتؔ کے انداز میں غزلیں کہتے تھے اور شروع شروع میں شاہ نصیرؔ جو ان کا استاد تھا۔ اکثر اس کا تتبع کیا کرتے تھے۔ مگر انہوں نے جو غزل سب سے پہلے مشاعرے میں پڑھی تھی ؎

رکھتا بہر قدم ہے وہ یہ ہوش نقش پا

یہ سوداؔ ہی کی غزل پر کہی تھی۔ اور اس نے یہ غزل میرزا بیدلؔ کی فارسی غزل پر لکھی تھی۔ اسی طرح اور بھی کئی غزلیں سوداؔ کے انداز میں لکھی ہیں۔ بلکہ سوداؔ کی پیروی میں ذوقؔ ابتدا ہی سے شوکت الفاظ و متانت کلام کے شیدائی بن چکے تھے۔

اگرچہ ذوقؔ کی ایک مفصل سوانحعمری مولٰینا آزاد نے آبحیات میں لکھی تھی۔ پھر اسکو قدرے پھیلا کر اپنے تالیف کردہ دیوان ذوق

کے ساتھ دوبارہ شایع کیا تھا۔ جس میں ذوق کی اس قدر توصیف اور انکے کمال کی اتنی توضیح کی تھی کہ شاید اسی رشک سے مولینا حالی کو اپنے استاد غالب کی ایک جامع سوانحمری لکھنی پڑی۔ اگر یہ دونوں سوانحمریاں پاس پاس رکھکر پڑھی جائیں۔ تو دونوں تذکرہ نویسوں کی طرزِ تحریر میں جو حقیقی فرق ہے اسکا راز کھل جاتا ہے کہ آزاد اتنے محقق نہیں تھے۔ جتنے کہ وہ انشا پرداز تھے۔ اور مولینا حالی اسکے برعکس ہیں۔

اسی طرح مولینا آزاد کے تبرکات میں فارسی شعرا کا جو تذکرہ بنام نگارستانِ فارس اب شایع ہوا ہے۔ اگرچہ خوبی تحریر میں مولینا شبلی کی شعر العجم کو نہیں پہنچتا۔ مگر آب حیات کی طرح مولف نے اس میں بھی اپنے خاص خاص تعصبات کو قائم رکھا ہے۔ مثلاً غنی کشمیری اور نور العین واقف بٹالوی جیسے عام فارسی گو شعرا کا حال تو لکھدیا ہے۔ لیکن مرزا غالب کو اپنے اس تذکرہ میں کہیں جگہ ہی نہیں دی ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ بھی غنیمت تھا جو انہوں نے غالب کا مختصر سا حال آبحیات میں لکھدیا تھا ورنہ مومن کا تذکرہ جسطرح آبحیات کے پہلے ایڈیشن میں قصداً نظر انداز کر دیا تھا۔ اگر وہ اس کو بھی نہ لکھتے

ا؎ دیکھو صفحہ ۲۴۶ کشف الحقائق جلد دوم - (امداد امام اثر)۔

توکون ان کے قلم کو پکڑ سکتا تھا۔ جبھی تو کہنا پڑتا ہے کہ آزاد شہر قلمرو انشاپردازی کے بادشاہ ہیں۔ وہ کچھ لکھتے وقت حالی اور شبلی کی مانند تمام کتب تاریخ وحوالہ کے دفتر کبھی ساتھ لیکر نہیں بیٹھتے نہ وہ شعرا کی سوانحعمریاں اسی طرح باقاعدہ ایک ترتیب کے ساتھ لکھتے ہیں جیسے کہ شبلی نے شعرالعجم کو لکھا تھا۔ یا حالی نے حیات سعدی کو مرتب کیا ہے۔ خیر۔ ذوق کے کمالات بیشک بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اپنے استاد کا کوئی نقص ظاہر نہیں ہونے دیا حالانکہ حالی نے غالب کے متعدد نقائص صاف صاف لکھدیے ہیں ذوق میں رباعی اور مثنوی لکھنے کی بھی خاصی قابلیت تھی۔ مگر مثنوی صرف ایک مختصر سی اس کے دیوان میں موجود ہے۔ اور رباعیات تو چند ایک کے سوا مطلق لکھی ہی نہیں ہیں۔ حالانکہ زمانہ موجودہ میں اخلاقی رباعیات اور مسلسل مثنویوں کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر وہ اس طرف بھی توجہ کرتے تو یقین ہے کہ ادب اردو کی یہ ایک بڑی کمی کسی قدر رفع ہو چکی ہوتی۔ غرض اردو غزلگوئی میں ذوق اپنے معاصرین پر فائق تھا۔ اور اس کی قادرالکلامی اور فوقیت کا خاص

سبب یہ ہوا کہ وہ بہادر شاہ ظفر کا استاد تھا - اور قلعہ معلیٰ میں دہلی
اور لکھنؤ کے شعرا کا تمام بہترین کلام وقتاً فوقتاً پہنچتا رہتا تھا - اور یہ
موقع اور کسی شاعر کو بہت کم نصیب ہوا ہے - گویا ذوق کی قوتِ شاعری
ظفر کی بدولت ہے - اور ظفر بھی ذوق ہی کے باعث آج ۴ دیوانوں
کا مصنف سمجھا جاتا ہے اور اسکا نام باقی ہے -

اُستاد و شاگرد یعنی ذوق اور شاہ نصیر کا تقابل

شاہ نصیر کی ایک غزل ہے ؎

تجھ کو ان آنکھوں سے ہمچشمی نہ کرنی تھی صدف
تھی اسی قابل ترا چیرا جسگر اچھا ہوا

حضرت ذوق فرماتے ہیں ؎

روز کہتا تھا مزا مجھ کو چکھا دے عشق کا
بھر دیا لون اس نے دل کو چیر کر اچھا ہوا

ان دونوں میں استاد کا شعر بہت بڑھ گیا ہے -

اسی طرح ذوق کا مطلع ہے ؎

رکھتے تھے جو کشورِ کسرےٰ و قیصر زیر پا

ہے انہی کا آج سر با تاج و افسر زیر پا لیکن

اسپر شاہ نصیر کا یہ .. مطلع لاجواب ہے ؎

سر پہ افسر چاہیئے نہ مسند زر زیر پا
ہم گدا ہیں خاک کا کافی ہے بستر زیر پا

مکمل دیوان ذوق میں ایک شعر ہے ؎

بو نہ گلمہدی کے گلبن رشکِ گل گملوں میں تو
آ کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسہ سر زیر پا

یہی شعر آزاد کی اصلاح یا کہ غلام رسول ویران کی اصلاح سے دیوانِ ذوق کے متداول نسخے میں یوں لکھا ہوا دیکھا گیا ہے ؎

نخل گل مہدی نہ بو نصف سبو میں اے نگار
تو کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسہ سر زیر پا

پہلے شعر سے یہ دوسرا شعر کسی قدر فصیح ہے۔ یہ فرق ذوق سلیم کے سوا اور کسی کو کم محسوس ہوگا۔ مگر اس قسم کی خفیف اصلاحوں ہی سے دیوان ذوق کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ اب مولینا آزاد آب حیات میں صاف انکار کرتے ہیں کہ یہ کام میرا نہیں ہے۔

تو اس پر سوال یہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر وہ کون ذوق کا درد خواہ تھا جو ایسی اصلاحیں کیا کرتا تھا۔

ذوق کی ایک اور غزل ہے ؎

ابر کیا آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برق کیا ہے تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

یہی شعر ایک اردو کورس میں اس طرح لکھا ہوا پایا گیا ہے ؎

ابرِ تر آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برقِ مضطر تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تاہم ذوق ہو یا غالب ایسی جزوی اصلاحیں خاص خاص اشعار میں ہر زمانہ میں ہوتی ہی رہی ہیں۔ ممکن ہے اگر آزاد نے ذوق کے بعض اشعار میں تصرف نہیں بھی کیا ہے۔ تو اہل ذوق نے ذوق کی غزلوں میں یہ تغیر و تبدل اس زمانہ کے مذاق کے مطابق ضرور کر دیے ہوں۔ اور ایسی جزوی اصلاحوں سے ذوق کی استادی میں کچھ فرق ہرگز نہیں آتا۔

ذوق نے کاکاسۂ سر کے مضمون کو جسطرح لکھا تھا وہ اوپر درج

ہو چکا ہے۔ نصیرؔ کہتا ہے ؎

جائے عبرت ہے یہ دنیا غافلو ڈرتے رہو
تاج تھا جس سر پہ ہے وہ کاسۂ سر زیرِ پا

حق یہ ہے کہ شاہ نصیرؔ کی یہ غزل ذوقؔ کی غزل سے کچھ کم نہیں ہے۔ بلکہ اصلیت اور تاثیر میں بعض شعر اس کے ترجیح کے لائق ہیں۔ مثلاً

عیب خود بینی نہ تھا معلوم اسکو ورنہ یہاں
آئینہ کو توڑتا رکھکر سکندر زیرِ پا

مزرعۂ دنیا میں وہی عاقبت سرسبز ہے
دانہ ساں جو خاک میں رہتا ہے ملکر زیرِ پا

ایک اور غزل میں شاہ نصیرؔ کہتے ہیں ؎

یوں اشک زمیں پر ہیں گرے منزل کو پہنچکر
جوں قافلہ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

استاد ذوقؔ فرماتے ہیں ؎

کیوں اتنا گرانبار ہے جو زادِ سفر بھی
اے راہروِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

نصیر ؎ ڈوب جائے کیوں نہ وہ مہر برشتہ تن آب میں ٭ غیر سے چھینٹے اڑے جب شوخ پرفن آب میں
ذوق ؎ تو جو دریا میں اڑا چھینٹے تو گیساں شرم سے ٭ پانی پانی ہو گیا اے شوخ پرفن آب میں

غرض ذوق جب تک شعرائے دہلی سے معرکہ آرا رہا نصیر اور سودا ہی کے لگ بھگ تھا مگر جب لکھنؤ میں رنگِ تغزل بدلا تو اس سے مستفید ہو کر اس کے کلام نے بہت رفعت حاصل کی جیسا کہ آیندہ واضح ہوگا۔

ناسخ اور ذوق

جسطرح نصیر کے کلام سے ذوق نے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح ایام شباب کے گذر جانے کے بعد ذوق نے زیادہ تر اہل لکھنؤ کی پیروی کی ہے اور اپنے کلام کو پیشتر سے زیادہ رنگین متین اور بامحاورہ بنایا ہے۔ مثلاً

ناسخ ؎ مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا،
آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا،

ذوق ؎ یوں تنِ خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا،
جسطرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا

یعنی ناسخ تو تحت الثریٰ کی خبر لاتے ہیں۔ اور استاد ذوق کنوئیں

کی کوڑی لاتے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے کو اُٹھے ہیں۔ لہذا چند امد مثالیں بھی واضح کیجاتی ہیں۔ شیخ ناسخ ؎

ہو وطن میں خاک میرے گوہر مضموں کی قدر
لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

ذوق ؎ اہل جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

اگر کوئی معمولی شاعر یہی شعر لکھدیتا تو سرقہ سمجھا جاتا۔

شیخ ناسخ ؎ بعد مردن بھی جو الفت شوخ چشموں سے مجھے
سبزۂ تربت چرا گاہِ غزالاں ہو گیا

ذوق ؎ بعد مردن بھی خیال چشم فتاں ہی رہا
سبزۂ تربت مرا وقف غزالاں ہی رہا

شیخ ناسخ ؎ پاک ہیں آلودگی سے جو ہیں خارستہ مزاج
تر نہیں ہوتا کبھی صرصر کا دامن آب میں

ذوق ؎ چشمۂ آئینہ میں کب تر ہوا پائے نگاہ
اس طرح جاتے ہیں دیکھا پاک دامن آب میں

ناسخ ؎ چشم جاناں اور ہے چشم غزالاں اور ہے
وضع انساں اور ہے ترکیب حیواں اور ہے

ذوقؔ ؎ آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

سوداؔ ؎ چھیڑ مت باد بہاری کہ میں جوں نکہت گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

ذوقؔ ؎ کہتا پیراہن گل ہے یہ نزاکت سے نسیم
ہاتھ مجھ کو نہ لگانا کہ نکل جاؤنگا

ناسخؔ ؎ ظالم کو بعد مرگ بھی ہی ظالموں سے ربط
خنجر کا دستہ کیوں نہ بنے کرگدن کی شاخ

ذوقؔ ؎ بے بہرہ انتفاع سے رہتے ہیں زجفا
ممکن نہیں کہ لائے ثمر کرگدن کی شاخ

ایضاً ؎ رہتے ہیں کشمکش میں پس از مرگ پر جفا
آخر کو زیر آرہ گئی کرگدن کی شاخ

ناسخؔ ؎ پابوس کو چمن میں جھکے نارون کی شاخ

ذوق سے سجدہ میں بہرِ شکر جھکے ناروں کی شاخ

اس تمام بحث سے ہمارا مقصد ذوق کی سُبکی کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے ذوق کی غزلیں شیخ ناسخ کو لکھنؤ میں پہنچائی جاتی ہوں اور وہ بھی ان سے استفادہ کرتا ہو جیسے کہ ذوق نے کیا ہے۔ لہذا یہ صریح معلوم ہوتا ہے کہ اکابر شعرا نے اس قسم کے استفادے کئے ہیں اور اپنے کلام کے پُر تاثیر کرنے کے لئے اور شعرا کے بعض ... زوردار الفاظ اپنے اشعار میں مستعار لئے ہیں۔ پس اس دستور سے بڑی احتیاط اور سلیقے کیساتھ مستفاد ہونا اور اپنے کلام کو پُر تاثیر بنانا گویا ہمارے لئے ہمیشہ ناگزیر ہے۔ چونکہ ہم ذوق کی عشقیہ غزلوں اور دیگر اشعار سے کچھ واسطہ نہیں رکھتے۔

اسکا ایک سہرا جواب ہے۔ مع ایک روایت کے مندرج ذیل کیا جاتا ہے۔

سہرا

نواب زینت محل بیگم کو بہادر شاہ کے مزاج میں بہت دخل حاصل تھا۔ جب ان دونوں کے چھوٹے بیٹے کی شادی کا موقع

آیا۔ تو بیگم موصوف کی فرمائش سے غالب نے یہ سہرا لکھا ہے

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دُولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابر بہار
لائے گا تاب گرانباریٔ گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں،
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

اس مقطع سے ظفر کو کچھ ملال ہوا۔ اور یہ خیال کیا کہ استاد ذوق پر چوٹ کی گئی ہے۔ جب حسب معمول ذوق دربار میں آئے تو بادشاہ نے اس سہرے کے جواب میں اور سہرا کہنے کی فرمائش کی۔ اس پر ذوق نے فی البدیہہ یہ سہرا لکھا جو حقیقت میں غالب کے سہرے کے ہر طرح برابر ہے۔ ہندوستان کے اور سینکڑوں شعرا نے

اسی زمین میں سہرے لکھے ہیں۔ جن سے ایک گلدستہ سہرا بن کر شائع ہو چکا ہے۔ اور اس میں داغ و امیر جیسے قادر الکلام شعرا کے لکھے ہوئے سہرے بھی موجود ہیں۔ مگر ابتک غالب اور ذوق ہی کے سہروں کے سر سہرا ہے۔ ذوق کا سہرا مندرجِ ذیل ہے۔

سہرا

اَے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نَو کی لگا کر سہرا

تابشِ حُسن سے مانند شعاعِ خورشید
رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے صلّے اللہ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رو نمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کی

دم نظارہ تیرے روئے نکو پر سہرا

در خوش اب مضامین سے بنا کر لایا

واسطے تیرے ترا ذوق ثناگر سہرا

جسکو دعوئے ہو سخن کا یہ سنا دے انکو

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

جب مرزا غالب کو اس بات کا علم ہوا۔ کہ ذوق کا یہ سہرا کیوں لکھا گیا تھا تو اس نے فوراً معذرت چاہی اور یہ قطعہ بادشاہ کے حضور گذرانا ہے

منظور ہے گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سی ہی پیشہ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہی صلح کُل
ہرگز کبھی کسی سی عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہی یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استاد شہ سی ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جام جہاں نما ہی شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سی مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر ۔ دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات ۔ مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ ۔ سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں ۔ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ!
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

لیکن ایسے دھوم دھام کے سہرے جس دولہا شہزادے اور جس دلہن شاہزادی کیلئے لکھے گئے تھے۔ افسوس کہ یہ شادی انہیں راس نہ آئی۔ کیونکہ غدر ہو گیا اور ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون بھیجدیا گیا۔ اس کے ہمراہ زینت محل بیگم اور اس کا خاوند میرزا جوان بخت بھی اسیرِ فرنگ ہوئے اور وہ برہما پہنچائے گئے جہاں اس بدنصیب شہزادہ اور شہزادی دونوں کی باقی عمر قیدہی میں بسر ہوئی۔ آہ ظفر نے کیا خوب کہا ہے ؎

نہ ہنسو دیکھ کے تقدیر کو پلٹا کھاتے ۔ دیر لگتی نہیں تدبیر کو پلٹا کھاتے

تقابل

داغ اور امیر کے جن سہروں کا ہم نے اوپر ذکر کیا تھا - ان کا ایک اقتباس بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔ یہ سہرے نظام الملک آصف جاہ والیٔ دکن کی تقریب کتخدائی کے موقع پر دربار میں پیش ہوئے تھے۔

داغ

ہے سجا آصفِ نوشاہ تجھی پر سہرا
عیش کا طرہ ہے شادی کا ترے سر سہرا

ہے جو نوشاہ کی پر نور جبیں پر سہرا
اس سے چمکانے لگا اپنا مقدر سہرا

مردمِ دیدہ بھی یہ چاہتی ہیں پیش کریں
کشتیٔ چشم میں مژگاں کی لگا کر سہرا

لاگ سے لڑتی ہے اک ایک لڑی مل مل کر
گل و گوہر کا ہے جو سہرے کے اوپر سہرا

گرمیٔ حسن سے بے چین ہیں ساری لڑیاں
رخِ نوشہ پہ ہوا کھائے نہ کیونکر سہرا

کیا خوشی اس کو ہے پھولا یہ سماتا ہی نہیں
اپنے جامے سے ہوا جاتا ہے باہر سہرا

تیرے ہی فرق مبارک کے لئے زیبا ہے
یہ معنبر، یہ معطر، یہ منور سہرا

آئینہ سکتے میں تھا آرسی مصحف کے وقت
اٹھا دلہا و دلہن کا جو برابر سہرا

جیسے دریا میں ہو سورج کی کرن جلوہ نما
یوں ہوا عکس فگن فرش صفا پر سہرا

یہی شہرت ہے یہی دھوم یہی چرچا ہے
آدم و حور و پری گاتے ہیں گھر گھر سہرا

جاں نثاری کو ترے شوق سے ہے آج کے دن
لائے اپنی رگ جاں کو بنا کر سہرا

آج نوشاہ ہے محبوب نظام آصف جاہ
ہو مبارک اسے اے خالق اکبر سہرا

یہ بنی اور بنے کے لئے زیبا ہے بناؤ

بیاہ کی رسم ہے شادی کا ہے زیور سہرا
حق بجانب ہے اگر شاہ سے ہو داد طلب
تو نے اے داغ کہا سب سے بچا کر سہرا

حضرت امیر مینائی لکھنوی

ان کے دو سہروں کا انتخاب سطور ذیل میں مرقوم ہے

کیا ہی محبوب ہے نوشاہ کے سر پر سہرا
ہے نقاب رخ یوسف سے بھی بڑھکر سہرا
شاہ نوشاہ بنا باندھ کے سر پر سہرا
بنگیا افسر اقبال سکندر سہرا
جگمگاہٹ میں ستاروں سے ہے بڑھکر سہرا
ہے کرن حور کے دامن کی یہ پر زر سہرا
رات دن تار نگاہوں کا لگا رہتا ہے
کبھی چلمن سے نکلتا نہیں باہر سہرا
چار چاند اور لگیں اور ستارے چمکیں

چاند کو ماند کرے چاند سے منہ پر سہرا

موتی تاروں میں پروئے ہیں کہ یہ آیا ہے
سیدہی سڑکوں پہ لٹاتا ہوا گوہر سہرا

چمن شرع کا اک پھول ہے عقد تزویج
عطر سے خُلق نبی کے ہے معطر سہرا

تجھ سا نوشاہ نہیں دیکھا قسم کھاتا ہے
ہاتھ رکھ رکھ کے ترے مصحفِ رُخ پر سہرا

لوٹ عارض پہ کبھی ہے کبھی پیشانی پر
ایک صورت پہ ٹھہرتا نہیں دم بھر سہرا

تہنیت کے لئے فردوس سے آتی تھی بہار
چہرہ پر لوٹ گئی ہے وہیں بنکر سہرا

آتی ہیں دیکھنے نوشاہ کو جناں سے حوریں
اور پلٹ جاتی ہیں آنکھوں سی لگاکر سہرا

چاند سے منہ پہ ستاروں کو نہ لگجائے نظر
اس لئے ڈالے ہے آنچل ترے منہ پر سہرا

شوخ ایسا ہے کہ اڑتا ہے ہوا پہ ہاتھوں
مجھکو حیرت ہے کہ باندھا گیا کیونکر سہرا
یہ عروسی ہے سراپا برکات و حسنات
چہرہ ہے نور خدا موئے پیمبر سہرا
طرۂ تاج سلیماں کی ہے پوری تصویر
اے امیر آصف جمجاہ کے سرپہ سہرا

اسی طرح امیر مینائی نے ایک سہرا والیٔ رامپور کی شادی کے موقع پر لکھا تھا ؎

بنگیا حور کی آنچل ترے منہ پر سہرا
ناز و انداز کا ہے آج ترے سر سہرا
ہے ترے رُخ کی تجلی سے منوّر سہرا
طرّہ ہے طور کی چوٹی پہ یہ کیونکر سہرا
ہے جو نوشہ کا اشارہ صفتِ تار شعاع
گھر کرے دیدۂ خورشید کے اندر سہرا
پھول سے گالوں پہ نوشاہ کے پائی ہے جگہ

بزم شادی کو کرے کیوں نہ معطّر سہرا

کہو مالن سے مبارک ہو بنے کی شادی
طاق مسجد سے ذرا لائے چھوا کر سہرا

اپنے نوشاہ کو سینے سے لگایا میں نے
سر سے آنکھوں سے کلیجے سے لگا کر سہرا

جوڑا ہے یمن و سعادت کا بنی اور بنا
ایک کے منہ پہ کھلا ایک سے بہتر سہرا

چشم بد دور بھبن کی ہے ترقی کیا کیا
حسن زیور ہے تو ہے حسن کا زیور سہرا

شوخیٔ حسن سے نوشاہ کے جو شرمائے
ایک صورت سے ٹھہرتا نہیں دم بھر سہرا

جوڑ پورا ہے یہ جوڑی کے لئے نیک ہی فال
اور اک چاہیئے سہرے کے برابر سہرا

تارے کہتے ہیں بنے سے کہ ذرا تم کہدو
دے جگہ ہم کو بھی اس چاند کے رُخ پر سہرا

سر ہے نوشہ کا مرے سارے سروں کا افسر

سارے نوشاہوں کے سہروں کا ہی افسر سہرا

داغ و حالی ہیں اسیر اب جو نہیں غالبؔ و ذوقؔ

ان سے ہوں داد طلب کہہ کے سخنور سہرا

نظمِ ترکِ دنیا و قطعِ تعلقات

ذوقؔ نے عنوانِ بالا پر پہلے ایک رُباعی لکھی تھی - پھر اسی کو پھیلا کر ایک قطعہ کر دیا ہے - ہم ان دونوں کو یہاں نقل کرتے ہیں -

رُباعی

اے ذوقؔ کریگا کوئی دُنیا کیا ترک دنیا ہے بُری بلا ارے کیسا ترک

ممکن نہیں ترک ہو کسی سے دنیا جب تک نہ کرے آپ اسی دنیا ترک

قطعہ

کل ایک تارکِ دُنیا سے میں نے پوچھا ذوقؔ

کہ تو اکھڑ کے ادھر سے ادھر ہوا پیوست

گزرتی ہوگی بآرام زندگی تیری!

کہ تجھ کو اب نہ غم نیست ہے نہ شادیٔ ہست

کہا یہ اس نے کہ قیدِ حیات ہیں انساں،
کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مستِ الست
اُٹھائے ہاتھ جہاں سے ولے ہے کیا امکاں
کہ با فراغ کروں کنجِ عافیت میں نشست
چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی
تو سلسلہ میں فقیری کے پھر ہوا پابست
رہا وہ خدمتِ مرشد کی قید میں برسوں
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقامِ اعلےٰ پر
کہا یہ شوق نے ہو ہمت بلند نہ پست
جو دستگاہ تصوّف میں بھی ہوئی اس کو
تو یہ ارادہ رہا اور بھی ہوں بالا دست
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی
کہ نفس دشمنِ سرکش ہے اسکو دیجو شکست
جو ہوشیار ہے تو ہے وہ شرع کا پابند

پھنسا ہُوا ہے وہ کیفیتوں میں گرہے مست
نہیں ہے دامِ علائق سے مطلق آزادی
مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کر کے جست
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ
گیا زباں سے نکل اسکی جیسے تیر از شست
کہ کرد قطعِ تعلق کدام شد آزاد
بریدہ زمہہ باخدا گرفتار است

قصائد ذوق

قدیم طرز کے قصیدوں کا ایک نمونہ وَلی کے حال میں دیا گیا ہے کہ جس کو زبان اُردو کا اولین قصیدہ خیال کرنا چاہئے اس کے بعد اس فن میں جقدر ترقی ہوئی اس کا اعلیٰ نمونہ سودا کے قصائد ہیں۔ جنکا ایک نمونہ حالات سودا میں درج ہو چکا ہے مگر ذوق کے قصیدے سوداؔ کے قصیدوں پر قدرے فوقیت رکھتے ہیں۔ ایک تو ان میں تشبیب پُر زور الفاظ میں ہوتی ہے۔

اور گریز بھی پسندیدہ ہے اور خاتمہ تو نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔
تاہم سوؔدا کے اکثر قصائد میں ظرافت کی جو چاشنی ہے۔ ذوقؔ نے
اسے مبتذل سمجھکر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لئے وہ قصیدے زیادہ
متین اور ذوق کی قادر الکلامی پر دال ہیں۔

چونکہ ذوؔق کے قصیدے پرانی وضع کے ہیں اور سوؔدا کے
قصائد سے کچھ مختلف نہیں ہیں اس لئے بخوف طوالت یہاں
کوئی نمونہ نہیں دیا گیا۔ مکمل دیوان ذوؔق میں ملاحظہ فرماویں +

اسد اللہ خاں غالب دہلوی

وفات ۱۸۶۹ء

۱۷۹۶ء میں آگرہ میں متولد ہوئے۔ جہاں نظم اردو کے
دو اور صاحب ایجاد میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی بھی پیدا ہوئے
تھے۔ آخر الذکر سے مرزا نے مکتبی تعلیم حاصل کی تھی یا کہ نہیں؟
اب اس بحث کا تو فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں عبد الصمد ایرانی
سے انہوں نے فارسی زبان کو اسطرح تحصیلا تھا کہ اس زبان کے

حسن وقبح اہل زبان کی طرح اوائل عمر ہی میں پہچان گئے تھے۔ یہ شخص عبد الصمد جو پارسی نژاد تھا۔ خاص ملکِ ایران سے یہاں آیا تھا۔ وہ فارسی اور عربی زبان میں کمال دستگاہ رکھتا تھا۔ مرزا نے اس سے صرف دو اڑہائی برس پڑہا ہے۔ مگر ایک ہونہار طبیعت کیلئے اہل زبان کی رفاقت خواہ ایک قلیل عرصہ ہی کے لئے کیوں نہ ہو عموماً بڑی مفید ثابت ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ غالب نے تمام عمر اس خاص استفادہ کی بدولت ایرانیوں کی طرح فارسی غزلیں اور قصیدے لکھے ہیں۔ اور ایک عجمی نہ آمیختہ بہ تازی زبان جیسے کہ دستنبو میں اس نے لکھی ہے۔ وہ بھی اسی تلمذ کا ثمرہ ہے

جب برہان قاطع کے متعلق تمام ہندوستان کے ادبائے فارسی سے مرزا کے معرکے اور مجادلے ہوئے۔۔۔ تو غالب نے اپنی فارسی دانی کا سکہ سب کے دلوں پر بٹھا دیا تھا۔ یہ بھی اسی اہل زبان (د) کی رفاقت اور صحبت کا ایک فیضان تھا۔ اس لئے شعرائے اردو کو حتی الامکان اس قسم کے خاص مواقع ضرور حاصل کرنے چاہئیں۔ اور اب تو دلی یا لکھنؤ ریل کے توسط سے کچھ دور

بھی نہیں رہا ہے۔ بلکہ دلی اور لکھنؤ ہی پر کیا حصر ہے۔ ریل اور جہاز نے اصفہان اور شیراز تک کو گویا ہندوستان کے ہر ایک کونے کھدرے ملا دیا ہے۔ اب بھی کسی قسم کے اہل زبان کو اُردو کے ہوں یا فارسی کے اگر اپنے سے دور سمجھا جائے۔ تو یہ امر تکمیل فن کے حق میں ایک قسم کی غفلت خیال کی جائے گی۔

برہان قاطع

مرزا غالب نے برہان قاطع کے جواب میں قاطع برہان لکھی تھی جس میں لغت مذکور کی اکثر غلطیاں چُن چُن کے رکھدی تھیں۔ اسپر محققین ادب فارسی میں سخت نزاع پیدا ہوئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کسی زبان کو اہل زبان ہی کی طرح ہمیشہ برتنا چاہیے۔ مگر فارسی کے جو الفاظ مستند یا دلی ہو جائیں یا کوئی واضع لغات انکو کسی طرح وضع کروے اور وہ اسی طرح ملک میں رائج ہو جائیں۔ تو ان لفظوں کو پھر اسی غلط سلط حالت میں ہی ہمارے ہاں مستند سمجھا جائے گا۔ خواہ اہل زبان اسکو جائز رکھیں یا نہ رکھیں۔ مثلاً لالٹین اب ایک اُردو لغت ہے۔ جسکی اصل لیٹن ٹرن بزبان انگریزی ہے۔ اگر اس

وقت یہ کوشش کیجائے۔ کہ اس لفظ کو خالص اہل زبان ہی کی طرح بولا جائے۔ تو پھر ہمیں تمام اردو زبان کو جہاں کہیں یہ لفظ اصلاح برتا گیا ہے بدل دینا پڑیگا۔ اور یہ غیر ممکن ہے پس آجکل اردو زبان میں فارسی قدیم کے جو الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اگر ایران میں ان کے معانی و مطالب مرور زمانہ سے بدل گئی ہیں تو اس بات سے ادب اردو میں ہمیں کچھ سروکار نہ رکھنا ہوگا۔ مگر مرزا صاحب کا مقصد ان خاص اعتراضات سے یہ تہا۔ کہ اہل ہند بھی ایرانیوں ہی کی طرح ہمیشہ خالص فارسی زبان میں نثر و نظم لکھا کریں اور یہ پابندی سخت مشکل تھی۔ پس اس میں مرزا صاحب تو ناکام رہے۔ مگر برہان قاطع اتنک فارسی کی ایک مستند لغت تصور کیجاتی ہے۔ اور قتیل و واقف وغیرہ جن کو مرزا نے اس بحث میں خوب لتاڑا تھا[۵]۔ ان میں سے قتیل کو ہر ایک فارسی تذکرہ نویس نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور واقف بٹالوی تو وہ خوش قسمت پنجابی شاعر ہے کہ مولینا آزاد نے نگارستان فارس میں اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ شیخ علی حزین

[۵] ملاحظہ ہو غالب کی مثنوی باد مخالف۔

قزوینی بنارس میں مقیم تھا۔ جبکہ واقفؔ سے اس کی ملاقات ہوئی وہ اس سے ملکر بہت خوش ہوا۔ اور بغلگیر ہو کے کلام سُنا اور اس کی بہت داد دی۔ بلکہ اہل ایران بھی اسکے اشعار سُنکر عموماً محظوظ ہوجاتے تھے۔ مگر جہانتک واقفؔ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے وہ بڑا سیاح تھا۔ اس نے چل پھر کر بھی اپنے کلام کو بہت شہرت دلائی تھی۔ چنانچہ احمد شاہ درانی کے دربار میں کابل تک پہنچکر رسائی پیدا کی اور اپنا کلام سنایا۔ مگر یہ سب شعرا غالبؔ کے نکتہ نگاہ سے بہت گرے ہوئے تھے۔ اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ مرزا کے حد کمال تک ہرگز نہیں پہنچ سکے۔ تاہم ایسے ہیچ میرز بھی نہیں تھے جیسا کہ مرزا نے ان کو خیال کر رکھا تھا۔ لہذا مرزا صاحب کے قلم سے ہندوستانی نژاد فارسی کے متعلق جو جو خاص اصطلاحیں قاطع برہان کے نام سے اُس وقت چھپی تھیں۔ وہ کچھ زیادہ بارآور نہ ہوئیں۔ اور نہ ہو ہی سکتی تھیں۔ کیونکہ جس امر میں جمہور کی رائے متفق نہ ہو خصوصاً تعین لغت میں اس جگہ ایک واحد شخص کی رائے کبھی سر سبز نہیں ہو سکتی۔ مرزا کی ابتدائے شاعری غزل اُردو سے ہوئی تھی

جس میں وہ پہلے بیدل کا مقلد و متبع ہوا۔ پھر جب فارسی زبان کا
چسکا پڑا تو اردو کے ساتھ فارسی بھی کہتا رہا۔ چنانچہ یہ دستور ہندوستان
میں زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ کہ ایک اردو دیوان کے ساتھ شعرا
اپنا فارسی دیوان بھی اظہار فضیلت و تکمیل فن کی غرض سے کہتے رہے
ہیں۔ مثلاً سودا۔ مظہر۔ میر درد اور انشاء اللہ خاں وغیرہ کے
اردو اور فارسی ہر دو قسم کے دیوان موجود ہیں۔ مگر یہ لوگ اپنی
توجہ عموماً اردو ہی پر زیادہ صرف کیا کرتے تھے۔ بخلاف اس کے
غالب نے اپنا اکثر وقت فارسی اشعار کی تصنیف میں خرچ کیا۔
اور زمانہ آیندہ کا کچھ خیال نہ کیا۔ چنانچہ وہ اردو کلام کہ جس کی اُس
کی نظروں میں کچھ قدر و قیمت ہی نہ تھی۔ اب وہی ہر جگہ شوق سے
پڑھا جاتا ہے۔ اور اُن کے فارسی کلام کو محض خاص خاص شعرا
اگر بہ نظر استفادہ پڑھتے ہوں تو شاید پڑھتے ہونگے۔ ورنہ اس
زمانہ میں ادب فارسی کا تو گویا چرچا ہی باقی نہیں رہا ہے۔ لہذا
مرزا غالب کی اسقدر محنت اور علمی مشقت کا سخت افسوس ہوتا ہی
وہ خود بھی معترف ہیں کہ اشعار فارسی جن کے لکھنے میں انہوں نے اتنی

زحمت اٹھائی تھی۔ اب ان کو کوئی منہ بھی نہیں لگاتا۔ مگر غور کرو یہ قصور کس کا ہے؟ شعرا کو ہمیشہ اقتضائے حال کی بھی کچھ خبر رکھنا چاہیئے اور اپنا قدم ہمیشہ زمانے کی آیندہ رفتار کے مطابق اٹھانا چاہیئے۔ تاکہ ان کی یہ علمی و ادبی محنتیں جن میں اور سب امور کی نسبت دماغ کو بہت زیادہ کلفت اٹھانی پڑتی ہے۔ بالکل رائگاں نہ جائیں؀

اُردو دیوان غالب

مرزا نے ۹ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو رقعات بیدل وغیرہ مکتب میں پڑھائے گئے ہونگے۔ جو اکثر درس و تدریس کی کتابوں میں ابتک شامل ہیں۔ اس لیئے اس کی توجہ لڑکپن ہی سے حضرت بیدل کی طرف منعطف ہوگئی۔ چنانچہ اس نے زبان اُردو میں بیدل کے تتبع سے اپنی شعر گوئی کی ابتدا کی۔ اور وہ خود کئی جگہ اسکی طرف اپنی غزلوں میں اشارہ بھی کرتا ہے۔ مثلاً ؎

اسد ہر جا سخن میں طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

یاس مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

(میرزا اسد کی شاعری)

غالب کی وہ غزلیں جن میں تخلص اسد واقع ہوا ہے۔ وہ اس کے آغازِ شباب یعنی پچیس برس کی عمر تک تصنیف ہوئی تھیں۔ افسوس ہے کہ مہملات غالب کی نظریں زیادہ تر انہی غزلوں میں پائی جاتی ہیں

مثلاً ؎ چار سوئے عشق میں صاحب دکانی مفت ہے
نقد ہے داغِ دل اور آتش زبانی مفت ہے

زخمِ دل پر باندھیے حلوائے مغزِ استخواں
تندرستی فائدہ اور ناتوانی مفت ہے

نقد انجم تا بکے از کیسہ بیروں ریختن
یعنی اے پیرِ فلک شامِ جوانی مفت ہے

گر نہیں پاتا درونِ خانہ ہر بیگانہ جا
بر درِ نکشودۂ دل پاسبانی مفت ہے

چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے

برہو سہائے جہاں دامن فشانی مفت ہے

یک نفس ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عمر میں،

حیف ہے ان کو جو کھوئیں زندگانی مفت ہے

مال و جاہ و دست و پائے زر خریدہ ہیں اسدؔ

پس بہ دلہائے دگر راحت رسانی مفت ہے[۱]

اس غزل میں جو صاحب دکانی مفت ہے۔ اور پاسبانی مفت ہے کے ردیف و قافیے منتخب کئے گئے ہیں۔ اس سے تو صاف پایا جاتا ہے کہ ابتدا میں مرزا کو اتنی تمیز بھی نہیں تھی کہ غزل میں سب سے پہلے خوبی یہ ہوا کرتی ہے کہ اس کے لیئے ردیف و قافیے اور زمین نہایت عمدہ انتخاب کی جاتی ہے۔ اب ان کی اسی زمانے کی ایک اور غزل بھی ملاحظہ ہو ؎

حکم بیتابی نہیں اور آرمیدن منع ہے

باوجود مشق وحشتہا۔ رمیدن منع ہے

شرم آئینہ تراش جبہۂ طوفان ہے

آب گردیدن روا لیکن چکیدن منع ہے

[۱] ملاحظہ نسخہ حمیدیہ دیوان غالب۔

مانع بادہ کشی ناداں ہے لیکن اَے اسد

بے ولائے ساقیٔ کوثر کشیدن منع ہے

ایک معترض نے غالب سے کہا تھا کہ تمہارے شعر عموماً ایسے ہوا کرتے ہیں۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال

پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

اس پر غالب بہت چکرائے تھے اور کہا تھا کہ یہ شعر میرا نہیں ہے اگر جو اشعار اوپر لکھے گئے ہیں وہ تو اس سے بھی گئے گذرے ہیں غرض مولانا حالی نے مرزا کی سوانحمری میں یہ شعر ان کی ابتدائے مشق کے زمانے کے نقل کئے ہیں۔

بحسرت گاہ ناز کشتۂ جاں بخشیٔ خوباں

خضر کو چشمۂ آب بقا سے ترجبیں پایا

رکھی غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ

اشارت فہم کو ہر ناخن بُریدہ ابرُو تھا

پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش

خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا

ان پر خواجہ صاحب موصوف یوں معترض ہیں کہ یہ اشعار اردو کی عام بول چال کے خلاف ہونے کے علاوہ لطافت اور فصاحت سے بھی بعید ہیں۔ یہ صحیح ہے۔ مگر یہ مرزا غالب کے وہ خاص خاص اشعار ہیں جو کہ کئی سال متواتر مشق اور شب و روز کے مشغلۂ شعرگوئی کے بعد لکھے گئے تھے۔ اور جو ان کی سابقہ غزلوں صاحب دکانی مُفت ہے اور رمیدن کشیدن منع ہے وغیرہ سے جو اوپر درج ہوئیں۔۔۔ بدرجہا بہتر اور بامعنی ہیں۔

دیوانِ غالب جدید یعنی نسخۂ حمیدیہ یا اور مرزا غالب کے اردو دیوان کی شرحیں

دیوان غالب اردو کا یہ نسخہ تمام پرانے ایڈیشنوں سے بہتر اور مکمل ہے اور ڈاکٹر بجنوری کی حیاتِ غالب سمیت حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ علاوہ ازیں دیوان غالب کی متعدد شرحیں بھی چھپی ہیں لیکن مرزا کی شاعری دراصل ایک قسم کا معمّہ ہے کہ جسکی سینکڑوں

تفسیریں اور تشریحیں آجکل کے اخبارات و رسائل میں طبع ہو چکی ہے اور پھر بھی کوئی نہ کوئی بات اس کے متعلق لکھنے سے رہ جاتی ہے حال میں ڈاکٹر بجنوری نے اپنے تذکرہ غالب میں جسکو انجمن ترقی اردو نے بجنسہٖ شایع کر دیا ہے۔ افکار غالب کو تمام یورپ کے مشہور شاعروں فلاسفروں اور نامور ادیبوں کے خیالات سے موازنہ کر کے دکھایا ہے کہ مرزا صاحب کی شاعری ہر طرح کے اخلاق اور اعلیٰ سے اعلیٰ فلسفی نکات اور جذبات پر مبنی ہے۔ بلکہ اس قدر مبالغہ سے لکھا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو کتابیں الہامی کہلانے کی مستحق ہیں۔ ایک تو وید اور دوسرا دیوان غالب۔ لیکن اس لایعنی محض اور غیر ضروری تعریف سے متاثر ہو کر معارف کے ایڈیٹر نے ایک دفعہ لکھا تھا۔ کہ ڈاکٹر بجنوری کے قول کے مطابق غالبؔ نے پہلے ملک یورپ کا تمام سائنس۔ فلسفہ اور ادب پڑھ لیا ہوگا۔ اور پھر اس نے شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہوگا۔ حالانکہ ابتدائے شعر گوئی میں غالب کو جو الہامات ہوئے تھے وہ اوپر درج ہو چکے ہیں۔ غالب کا سارا کمال دراصل یہ ہے

سلہ بحوالہ معارف اپریل ۱۹۲۱ء

کہ اس نے بیس پچیس برس کی یاوہ گوئی سے جتنا مواد نظم جمع کر لیا تھا اس کو مولینا فضل حق کی (جو ایک اعلیٰ درجہ کے سخن فہم اور فاضل ادیب تھے) نظر سے گزرانا تھا۔ اور انہی کے مشورہ سے یہ ایک چھوٹا سا دیوان اردو مرتّب کیا تھا۔ یعنی کل ۱۸۸۳ اشعار میں سے صرف ۱۴۸۸ اشعار رہنے دئے تھے۔ گویا ایک اکیلے دیوان میں سے یک لخت چار سو اشعار قلمزن کر دئے گئے تھے۔ آج کون شاعر ہے جو ایسا کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے۔ جبھی تو آجکل شعرا کا اکثر کلام محض قافیہ پیمائی۔ تازگی سے خالی اور عام بھرتی خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ بلند و پست خیالات کی باہم آمیزش سے بعض اعلیٰ ترین شعرا کے کلام میں بھی وہ ناہمواری پائی جاتی ہے کہ جس سے طبیعت بدمزہ ہو جاتی ہے اور بقول حالی کہنا پڑتا ہے کہ کلیاتِ ظفر میں تازگی خیال مفقود ہے وغیرہ وغیرہ یا امیر مینائی کی غزلوں میں ضرورت سے زیادہ بھرتی کے شعر ہیں۔ جس سے اس کی غزل قصیدہ کی طوالت کو پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس کے پڑھنے سے کچھ لطف نہیں آتا۔ جب شعرا اپنے ردّی سے ردّی شعروں کو بھی اپنی کسی

غزل سے قطع کرنا نہیں چاہتے۔ اتو وہ غزل ناہموار ہو کر پڑھنے والے کی طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔ خیر یہ عیب مسلسل نظم میں کسی قدر کھپ سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا رُوم کی مثنوی میں بھی بیسیوں ایسے نقص اب نکالے گئے ہیں۔ مگر مجموعی حیثیت سے اس نظم کے متعلق کہا گیا ہے ؎ ہست قرآں در زبان پہلوی۔

گلزارِ نسیم اور مثنوی بدر منیر کے تمام حصے بھی یکساں فصیح و بلیغ ہرگز نہیں ہیں۔ مگر ایک مسلسل اخلاقی نظم میں اگر کچھ فقرے کمزور اور بھرتی کے بھی ہوں تو کام چل جاتا ہے۔ جیسے کہ رباعیاتِ حالی اور مسدسِ حالی میں کئی مصرعے بہت اچھے نہیں لگائے گئے۔ تاہم بندش کی خوبی اور سلاستِ زبان نے سب قسم کے عیوب پر پردہ ڈال دیا ہے۔ القصہ غالب کا اُردو دیوان جب مختصر ہو کر چھپا اور لوگوں کی نظروں میں ہمیشہ وہی آتا رہا۔ تو اس کے نقائصِ کلام سے آجتک آگاہی کسی کو نہیں ہوئی۔ مگر یہ نسخہ حمیدیہ جسوقت سے شایع ہوا ہے۔ تو یہ راز اب کھل گیا ہے۔ کہ غالب نے اپنی اس وقت پسند شاعری میں بڑی محنت اور بیس پچیس سال کی متواتر مشق سے

ؔ بقول شبلی ۔۔۔ (شعر العجم)

انتہائے کمال حاصل کیا تھا اور وہ الہامی درجہ جیسا کا ڈاکٹر بجنوری
نے ذکر کیا ہے غالب کو کامل مشق سخن کے بعد ہی عطا کیا گیا تھا۔
اگر میرزا کے ہمعصر شعرا نے اسکی ویسی قدر نہیں کی تھی۔ جیسا کہ اب
کی گئی ہے تو اس کے لئے اس کا وہ ناہموار اردو کلام ذمہ دار ہے
جو نسخہ حمیدیہ میں اب طبع ہوا ہے۔

مرزا غالب اور شعرائے فارسی

مولانا حالی نے غالب کی فارسی اور اردو نظم و نثر پر یادگار غالب
میں بہت شرح و بسط سے ریویو کیا ہے۔ مگر اس بیاض میں ہم وہی
باتیں لکھنا پسند کرتے ہیں کہ جو اور تذکرہ نویسوں نے بہت کم لکھے
ہیں۔ مثلاً ہم غالب کا مقابلہ نظیری اور ظہوری سے کرنا نہیں چاہتے
جیسا کہ مولانا موصوف نے کیا ہے بلکہ اس کے اردو کلام کو فارسی
کے صرف دو شاعروں بیدل اور جلال اسیر کے خیالات سے یہاں
موازنہ کر کے یہ بات دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ نہ صرف فارسی
شاعری بلکہ اردو غزل گوئی کے فن میں بھی ہندوستان کے بعض
متاخرین شعرائے فارسی ہی کا متبع رہا ہے۔

۱۔ بیدل

میرزا عبدالقادر نام ۔ بیدل تخلص ۔ خاص بخارا میں پیدا ہوئے۔ قبیلہ برلاس کے ترک تھے ۔ مگر ہندوستان ہی میں آکر پرورش اور تعلیم پائی تھی ۔ اس وقت ترکوں کے ان قدیم خاندانوں میں جو اس ملک میں آکر آباد ہو گئے تھے ۔ فارسی بمنزلہ مادری زبان کے لکھی پڑھی اور بولی بھی جاتی تھی ۔ اسلئے امیر خسرو ۔ بیدل اور غالب کے لئے فارسی گویا ایک گھریلو زبان تھی ۔

عنفوانِ شباب میں مرزا بیدل نے شاہزادہ محمد اعظم خلف عالمگیر کی کچھ عرصہ ملازمت کی تھی ۔ مگر پھر تارک الدنیا ہو کر آگرہ اور دلی میں بیٹھ رہا تھا ۔ اور ساری عمر اپنی وضع کی ایک خاص وقت پسند شاعری کے مشغلے میں گذار دی تھی ۔ اگرچہ جلال اسیر ۔ ظہوری ۔ عرفی اور صائب وغیرہ بھی نازک خیالیوں ہی میں اپنی عمریں بسر کر گئے ہیں ۔ لیکن حضرت بیدل کی نکتہ نگاری ان سب سے الگ تھی ۔ کیونکہ یہ انکی خاص ایجاد کردہ تھی ۔ بیدل کا انتقال ۱۱۳۳ھ میں ہوا ۔

اور غالب نے ۱۲۳۲ سنہ ہجری کے قریب اپنی اُردو غزل گوئی کی بنیاد ڈالی ہے۔ لہذا جسطرح ایک سو برس کے بعد بھی کسی نامور شاعر کا چرچا عوام کے درمیان اس حد تک پایا جاتا۔ کہ اسکی شاعری کی بعض طبقوں میں خاص طور سے تقلید کیجائے۔ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ (مثلاً ذوق اور غالب کو گذرے ہوئے آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوچکا ہے۔ مگر لوگ ان کی باتیں اسطرح کیا کرتے ہیں۔ جیسے کہ وہ کل ہی وفات پا گئے ہیں) ابھی بیدل کی یاد سب ہندوستانی شعرا کے دلوں میں تازہ تھی۔ اور میر سودا ناسخ۔ مصحفی وغیرہ مرزا بیدل کی فارسی غزلوں کو سنتے سناتے تھے (اور شاید اس کا کچھ اُردو کلام بھی اس وقت تک موجود ہو) کہ میرزا غالب نے دیوان بیدل کو نہایت غور سے پڑھا۔ اسی کچھ سمجھا کہ نہ سمجھا مگر اس کی مانند عام شاہراہ سے ہٹ کر اُردو میں شعر کہنا شروع کردیا جس طرح کولمبس محض راستہ سے بھٹک کر ایک نئی دنیا میں جانکلا تھا۔ یہی حال غالب کا ہوا کہ اس نے ایک نئی طرز کی شاعری تتبعِ بیدل سے قائم کی۔

میرزا بیدل ؎

یاد آں فرصت کہ عیش رائگانی داشتیم
سجدۂ چوں آسماں بر آستانی داشتیم

اسی غزل میں یہ شعر بھی ہیں ؎

یاد آں غفلت کہ از گرد متاع زندگی
عمر دامن چیدہ بود و ما دکانی داشتیم

دستِ ما محروم ماند آخر بطوف دامنش
خاک نم بودیم گرد ناتوانی داشتیم

اب ان اشعار کے معانی پر غور کرو۔ پہلا شعر "یاد آں فرصت" اس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ وہ فرصت ہمیں یاد آتی ہے۔ کہ آسماں کی طرح تیرے آستان پر جھکے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ اور گو اپنا وقت ضائع کرتے رہتے تھے۔ مگر اس سے بہت خوشی ہم کو حاصل ہوا کرتی تھی۔ غالب کہتا ہے ؎

گر نہیں پاتا درونِ خانہ ہر بیگانہ جا
بر درِ نکشودہ دل پاسبانی مفت ہے

یعنی تیرے گھر کے اندر کوئی بیگانہ شخص داخل نہیں ہو سکتا۔

اس لئے وہ اپنے دل کے بند دروازوں کے باہر جو پاسبانی کر رہا ہے۔ وہ گویا مفت کی یا ایک قسم کی رائیگاں پاسبانی ہے یعنی تو اس دل کے اندر ہے اور اس دل کی کبھی کشود کار نہیں ہوتی۔ بیدل اور غالب کے یہ شعر مختلف معنی رکھتے ہیں۔ مگر خیالات کی رو ایک ہی جیسی ہے۔ ہاں مرزا صاحب اچھی نومشق شاعر ہیں۔ اور فارسی شعرا کے خیالات کو اردو میں اچھی طرح کھپا نا نہیں جانتے۔

بیدل کے دوسرے شعر کا حاصل یہ ہے کہ وہ غفلت یاد آتی ہے کہ ہم اپنی زندگی کی متاع کو سر بازار یا دکان لگا کر بیچا کرتے تھے۔ اور ہماری عمر نے اس متاعِ زندگی کی گرد سے اپنا دامن چن لیا تھا۔ گویا زندگی سے بیزار ہو گئے تھے۔ اور اسکو کسی کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ غالب کہتا ہے ؎

مال و جاہ و دست و پائے زر خریدہ ہیں اسد

پس بدلہائے دگر راحت رسانی مفت ہے

یعنی اسد تیرا مال ہے اس کے ہاتھ پاؤں - مال و متاع سب تیرے زر خرید ہیں۔ پس اس قسم کا غلام گویا دوسروں کو مفت راحت پہنچایا کرتا ہے - یہ شعر بھی غالب کے مہملات میں شامل ہے ۔مگر ایک نو آموز نو یا دس برس کا بچہ اگر بیدل کی تقلید کرے تو وہ اسی قسم کے شعر کہہ سکیگا - کیونکہ ابھی زبان پر قدرت نہ ہونیکے باعث وہ کچھہ کا کچھہ بک جائیگا - بیدل ؎

دستِ ما محروم ماند آخر بطوفِ دامنش

خاک نم بودیم گرد ناتوانی داشتیم

میرزا بیدل کے اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ہاتھ جب تیرا دامن پکڑنے سے محروم رہا تو چونکہ ہم سخت ناتواں ہوگئے تھے اور ہمارا آبی و خاکی جسم بھی گویا ایک کمزور سی گرد بن کے اُڑنے لگا تھا - اور ظاہر ہے کہ گیلی مٹی اڑ اڑ کر کپڑوں کو ہمیشہ چمٹ جاتی ہے - پس اس خیال سے تیرے دامن کے ارد گرد طوف کرنے لگے - کہ شاید اسی وسیلہ سے تیرے دامن کے ساتھ پیوست ہو جائیں -

میرا بیدل کے اکثر اشعار اسی طرح دقیق و عمیق ہوا کرتے ہیں
اور گو بعض الفاظ اس میں موجود نہیں بھی ہوتے مگر ان کو قرائن
سے فرض کر کے اس کے شعر کا مطلب نکالنا پڑتا ہے۔ اسی
طرح کی مہمل شاعری غالب یا مرزا اسد نے بھی پہلے اختیار کی
تھی۔ چنانچہ اس کی وہ تمام غزلیں جو اسنے ابتداً لکھی ہیں۔ اشعار
بیدل ہی کی طرح کوہ کندن وکاہ بر آوردن کی مصداق ہیں۔

شعر بیدل ؎ نزاکت ہا است در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

یعنی مینا خانۂ حیرت یا عالمِ حیرت کے آغوش میں بہت سی نزاکتیں
ہیں۔ یا نازک حالتیں ہیں۔ تو حیران بنا رہ اور پلک نہ جھپکا۔
ورنہ اس پلک جھپکانے سے یہ مینا خانۂ حیرت لطفِ تماشا
شکست ہو جائیگا۔ مگر اس مضمون کو ایک صاف گو شاعر نے یوں
نظم کیا ہے ؎

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشہ
نظّارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

جو اس سے زیادہ فصیح اور دلپسند عوام ہے۔ یہی دنیا کا تماشہ اور مژہ کا برہم نہ ہونا۔ اس پر غالب لکھتا ہے ؎

زبسکہ مشق تماشہ جنوں علامت ہے
کشاد و بست مژہ سیلیٔ ندامت ہے

یعنی تماشا دیکھنے کی عادت ایک جنون کی علامت یا بُری بات تھی اس لئے مژہ کا برہم ہونا یعنی پلکوں کا کھلنا اور بند ہونا گویا سیلیٔ ندامت کا پڑنا ہے۔

میرزا بیدل کہتا ہے ؎

تا نفس باقی ست ممکن نیست ایمن زیستن
چوں گلوئے شمع باید بود ایمن زیستن

یعنی جب تک دم میں دم ہے زندگی آرام سے کبھی نہیں کٹ سکیگی اگر ہم کہ گلوئے شمع کی طرح یعنی اس کی بتی کی طرح خاموشی سے جلتے رہنا چاہیئے۔ کہ جسطرح وہ چپکے چپکے بھسم ہوتی رہتی ہے اور آخر فنا ہو جاتی ہے۔

میرزا غالب کہتا ہے ؎

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

بیدل ؎ منزل عیش تو وحشت کدۂ امکاں نیست
چمن از سایۂ گل پشت پلنگ است اینجا،

غالب ؎ نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

بیدل ؎ صد گریباں نسخۂ رسوائی ام آما ہنوز
یک الف از انتخاب مشق چاکم نالہ است

غالب ؎ یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

غرض میرزا غالب نے بیس پچیس برس بیدل اور بعض دوسرے فارسی شعرا کے کلام سے استفادہ کیا ہے۔ اور ان کی زبان پر ہمیشہ فارسی محاورے اور استعارے اور مضامین اسطرح چڑھے رہتے تھے حتیٰ کہ وہ اس بارہ میں یہاں تک غلو کرنے لگے تھے کہ اردو غزل میں نہ صرف فارسی محاورات کے ترجمے بلکہ اس کے مخصوص مضامین

بھی مستعار لینے لگے مثلاً ؎

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی ✦ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

دیوان غالب کے شارح حضرت نظم طباطبائی اس کو غزل کا ایک بہت سست شعر بتاتے ہیں۔ یعنی لکھتے ہیں کہ بلحاظ مضمون یہ بہت سُست ہے۔ مگر مرزا کو بیدل کی تقلید کرنا لازمی تھی۔ جس نے ایک غزل کی غزل بوریا کے ہی ردیف و قافیہ میں لپیٹ دی ہے۔ چنانچہ اس کا مقطع ہے ؎

بیدل فریب نعمت دیگر چہ مے خوری
مہمان را عظیم بسر خوان بوریا

غالب ؎ سرشک سر بہ صحرا دادہ۔ نور العین دامن ہے
دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

اس کے متعلق ایک لکھنوی شاعر حضرت یاس جو آتش کو غالب پر ترجیح دیتے ہیں۔ انہوں نے غالب کی بد مذاقی اسی شعر سے واضح کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ نور العین سے برخوردار کا تعلق۔ اور پھر برخوردار کے لئے بستر کا تلازمہ سبحان اللہ! یہ کیا کیا رعائتیں

ہیں کہ لکھنؤ والوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ لیکن غالب پرستوں
سے پوچھئے تو وہ اس شعر کی تشریح میں بھی کوئی نہ کوئی فلسفہ ٹھونک
دینگے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات صحیح ہے مگر غالب مجبور تھے۔ ان کو
ہر امر میں شعرائے فارس کی تقلید کرنی منظور تھی۔ جو بستر کے ایسے
مذموم مضمون کو بھی نظم کیا کرتے ہیں مثلاً بیدل ؎

خاکدانِ دہر بیدل مرکز آرام نیست
خوابِ ما آخر بریں بستر پریشاں میشود

غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھا
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

یہ شعر بیدل ہی سے ماخوذ ہے۔ مگر اسنے اس مضمون کو بڑے سلیقے
سے ادا کیا ہے ؎

در جستجوئے ما نکشی زحمتِ سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمے رسد

۲- جلال اسیر

شعر ؎ مشتِ خاکسترِ ما سرمۂ دل ساز اسیر
روشنائیت کہ در راہ خدا بخشیدند

ایک شعر غالب کا بھی اسی مضمون میں ہے۔ مگر غالب نے بڑھکر کہا

ہے ؎ سرمۂ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
تا رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

اسیر ؎ از صدف گر دیدہ دریا را زباں کام نہنگ
گوہر مقصود یعنی ایں چنیں پیدا شود

غالب ؎ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

اسیر ؎ ہوائے معتدل کشتِ پریشاں تر نمے سازد
ز برقی پرورد ہر لحظہ دہقاں حاصل ما را

غالب ؎ سراپا رہن عشق و ناگزیر الفتِ ہستی،
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

یہ دونوں آخری شعر مختلف معنی رکھتے ہیں۔ مگر خیال آرائی او نازکخیالی

میں مرزا کی اردو شاعری شعرائے فارسی کے فکرِ سخن کا گویا چربہ اترا ہوا ہے۔

استفادہ شعر و سخن

غالب نے کہاں تک متاخرین ادب فارسی سے استفادہ کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا اب بہت مشکل ہے۔ مگر ہمارے خیال میں اکابر شعراء کا راز کامیابی اسی قسم کے استفادہ کرنے ہی پر منحصر ہے جو ایسے طریق سے کیا جائے کہ شعر میں سرقہ۔ توارد یا اخذ کی ورباہت کا شبہ نہ پڑ سکے مثلاً خواجہ حسن نظامی نے بزم خسروی کے نام سے درگاہ حضرت نظام الدین صاحب اولیا کے عرس کے موقع پر حال میں ایک مشاعرہ کرایا تھا جس میں شرط یہ لگائی گئی تھی کہ شعراء صرف امیر خسرو کی غزلیں ترجمہ کرکے لائیں اور مشاعرے میں پڑھیں۔ اس موقع پر عموماً حضرت وحشی ندوی کے منظوم تراجم بہت پسند کئے گئے تھے۔ جنکا ایک اقتباس یہاں نقل ہوتا ہے۔

ترجمہ حضرت وحشی	امیر خسرو
وہ طیور کا نوازن سر شاخسار ہونا	ہرگاہ مرغے از سر شاخے نوا زند

ترجمہ حضرت وحشی	امیر خسرو
وہ کسی کو یاد کر کے میرا بیقرار ہونا	آید بدل کہ وقت رہ جان ما زند
کبھی ساتھ دوستوں کے جو چمن میں جا نکلنا	بوستانہا کاندرو بودیم خوش بازوستان
مری غمزدہ نگاہ میں گلوں کا خار ہونا	آن ہمہ گلہا تو پنداری سراسر خار بود
اس امید میں کہ شاید تری دید ہو میسر	ہر بامداد تا بہ شبم بر سر رہش
کبھی بیٹھ کا خاک سر رہگذار ہونا	وقتے مگر کہ بنگرم از دور ناگہش
وہ فغاں سے آگ برسا کہ جلا دی باغ بلبل	اے فاختہ زنالہ زن آتش بہ بوستان
کبھی گل سے تو وفا کی نہ امیدوار ہونا	از گل امید نیست کہ بوئے وفا زند
غم ہجر کی حقیقت وہی جانتا ہے خسرو	کسے نداند خسرو کہ چیست سوز فراق
جسے ہو نصیب وقف غم ہجر یار ہونا	جز آں کہ بر دل او چرخ داغ ہجراں زد

ان اشعار میں وحشی صاحب نے امیر خسرو کی مختلف الاوزان غزلوں سے شعر چن چن کر ترجمہ کئے ہیں۔ مگر ترجمے میں اپنا ردیف و قافیہ برابر قائم رکھا ہے۔ تاکہ سلسلۂ غزل ٹوٹنے نہ پائے۔ متاخرین شعرائے اردو اسی طرح شعرائے فارسی کے کلام سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ البتہ وہ اپنے مستفاد اشعار میں کچھ تغیر

وتبدل جو شعر کو زیادہ چمکا دیتا تھا کر لیا کرتے تھے۔ حضرت وحشی اگرچہ قیود مشاعرہ کے پابند تھے۔ مگر اس کے باوجود بھی ترجمہ کو اصل کر دکھایا ہے۔

آجکل ہمارے اکثر شعرا نظم انگریزی کے خیالات بھی اسی قبیل سی اپنی تالیف کردہ نظموں میں مستعار لیا کرتے ہیں۔ اور عوام کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا خود اپنے دماغ سے شعر لکھا ہے۔ حالانکہ ایسا بہت کم کیا جاتا ہے۔ غرض متقدمین سے استفادہ کرنا۔ یا اپنی زبان میں غیر زبانوں کے شعرا کے خیالات منتقل کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ لبشرطیکہ یہ اسی طرح پر کیا جائے جیسا کہ مرزا غالب نے بیدل۔ جلال اسیر۔ ظہوری اور نظیری وغیرہ کے کلام سی بتوسط استفادہ و استفاضہ کیا ہے۔

مرزا صاحب کے خاص خاص حالات

عموماً مرزا غالب کو دنیا و دین سے مطلق لاپرواہ۔ آزاد مشرب اور ایک غیرت دار آدمی تصور کیا جاتا ہے۔ مگر اعلیٰ، ذاتی اوصاف کا امتحان اس وقت کرنا چاہیے۔ جبکہ کوئی شخص پہلے امیر ہو۔ اور

پھر غیب ہو جائے۔ اور وہ اس حالت میں کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہ پھیلائے۔ مرزا غالب پیدا ہوتے ہی کئی جاگیروں کے وارث ٹھہرائے گئے تھے۔ اور سرکار کی طرف سے بھی ان کا وظیفہ جو بزرگوں کی کمائی تھی معقول مقرر ہوا تھا۔ مگر ۱۸۴۰ء یا ۱۸۴۲ء تک وہ سب سرمایہ جو اپنے بڑوں سے ان کو ورثہ میں پہنچا تھا صاف چٹ کر گئے تھے۔ اور پھر نوکری کے لئے گھر سے نکلے تھے چنانچہ طامسن صاحب گورنر شمال مغربی کے بنگلے پر پہنچے۔ اور وہ ان کی پیشوائی کو نہ آئے۔ اسی لئے وہ گھر کو لوٹ آئے۔ یہ لطیفہ اسی طرح سننے میں آیا ہے۔ مگر مولوی کریم الدین صاحب طبقات شعرائے ہند میں لکھتے ہیں۔ کہ صاحب بہادر نے تین آدمیوں کو دہلی کے اورینٹل کالج کی پروفیسری کے لئے بلوایا تھا۔ مرزا غالب۔ مومن اور صہبائی۔ ان میں سے مومن نے سو روپیہ ماہوار مانگا۔ اور صہبائی نے ۴۰ روپے ہی منظور کر لئے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ مرزا کا خرچ ایسی گئی گذری حالت میں بھی صرف ۴۰ روپے کی ملازمت سے کیسے چل سکتا تھا۔ لہذا ان کو انکار کرتے ہی بنی۔ اب پرستاران

غالب اسی ایک واقعہ پر چاہے کچھ حاشیہ چڑھائیں اور اُن کی آن تان اور غیرت کے افسانے گھڑ لیا کریں مگر ایک عادی شراب خوار رندِ مشرب آدمی کیونکر غیور ہو سکتا ہے لہذا مرزا کو بہت مدت تک اپنی بد مستیوں کا خمیازہ اٹھانا پڑا تھا۔ چنانچہ خود کہتا ہے ؎

قرض کی پیتے تھے مے اور جی میں کہتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ہم اس تحریر سے غالب کی کچھ سُبکی کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ مرزا کو اس کی عیاشی اور فضول خرچی نے سخت تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اور یہ واقعہ ہر شاعر کے لئے موجب عبرت ہے۔ ذرا غور فرمائیں کہ وہ شخص جو کسی کی زبان۔ کسی کے شعر۔ کسی کی غزل کو خاطر میں نہیں لایا کرتا تھا۔ اب اپنی بد اعمالیوں کی بدولت رات دن سرکار انگریزی کے حکام کی۔ صوبہ کے گورنروں کی قصیدہ خوانیاں کرتا ہے۔ اور ان کی بارگاہ میں دلی سے تنہا نکلکر کلکتے تک جاتا ہے اور آخر مایوس و ناکام ہو کر واپس آتا ہے۔ اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس کی زندگی سخت عذاب میں مبتلا ہو

جاتی ہے۔ یہ دردناک حالت اور شعرا کے لیے مجسم عبرت کا نمونہ ہے۔ کیونکہ شاعری کوئی کما کھانے کا فن ہرگز نہیں ہے کہ دین دنیا کا کوئی کام ہی نہ کیا جائے۔ اور صرف اسی پر تکیہ لگا کر انسان بیٹھ رہے۔ جیسا کہ مرزا غالب کا وطیرہ تھا۔ افسوس ہے۔ انتہا کا غرور۔ ناعاقبت اندیشی اور مرتے دم تک جام و صراحی سے سروکار رکھنا مرزا صاحب کی عادت بن چکی تھی۔ آخر کار۔ مرزا صاحب بالکل بے ہمت ہوگئے اور حکام وقت کی اسقدر قصیدہ خوانیاں ان کو کرنی پڑیں کہ سید انشا اور سودا کے قصائد سے بھی کچھ زیادہ خوشامدانہ قصیدے ان سے یادگار ہیں۔ ان باتوں سے خود مرزا صاحب کا بڑھاپا آخر بڑی تلخی کے ساتھ گذرا ہے۔ جس کے متعلق اردوئے معلے کے خطوط کافی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔

مرزا صاحب کے خانگی تعلقات

ایک فراخ دست فضول آدمی جو ضرورت سے زیادہ صرف ایک چیز شراب ہی پر اپنا اندوختہ صرف کر دیا کرے۔ اور ہمیشہ جرگوں

کی وراثت کے سر صدقہ قرض لے لیکر کھایا کرے وہ کب تک
اپنے بی بی بچوں کو خوش رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب کی نسبت
یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے عیالداری کے بوجھ کو اپنے حق میں ایک
مصیبت خیال کیا کرتے تھے۔ ایسا ہونا تو اس قماش کے لوگوں
کے لئے گویا لازم و لابد ہے۔ مگر مولانا حالی اور آزاد یقین رکھتے
ہیں کہ ان کے جو لطائف عذاب خانہ داری کے متعلق ہیں وہ تمام
لطائف مصنوعی ہیں۔ اور محض تفنن طبع کی خاطر لکھے گئے ہیں۔
مگر جیسا کہ واضح کیا گیا ہے یہ بات عام واقعات کے سراسر خلاف
ہے۔ کیونکہ میخوار انسان خواہ وہ کوئی ہو۔ بزرگ ہو۔ چھوٹا ہو
بڑا ہو۔ بے ہنر ہو صاحب کمال ہو۔ سب کو اس بد عادت کا
خمیازہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ پھر غالب اس سے کیونکر بچ سکتے
تھے۔ یہی شراب خوری انسان کو اتنا کمینہ خیال بنا دیتی ہے کہ
حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ سر سید (مرحوم)
مراد آباد گئے۔ تو رامپور کے تعلق سے مرزا غالب بھی وہاں موجود
تھے۔ مگر جب ملاقات ہوئی تو اپنی شراب کی بوتل چھپا دی۔ کہ

ان کی شراب کی بوتل سرِ راہ رکھی تھی اسکو آتے جاتے سے چھپایا
تو سر سید پر بھی شراب خواری کا الزام لگایا۔ (حیات جاوید صفحہ ۶۷)

مرزا غالب کا مذہب

آپ شیعہ تھے۔ مگر نماز روزہ سے کچھ سروکار نہ رکھتے تھے۔ اُردو فارسی غزلوں میں اور شعرا نے تو صرف زاہد اور شیوخ ہی کو طنز آمیز کلام سے یاد کیا ہے۔ مگر غالب نے خدا تک کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ اور بہشت و دوزخ پر تو عموماً مضحکہ کیا ہے یہ امر یا تو انتہا درجہ کی شوخ طبعی تھی یا میرے نزدیک وہ صوفیانہ دہریت و لامذہبی تھی۔ کہ جو بعض قابل شعرا مثلاً عمر خیام اور حافظ وغیرہ کا بھی دستور رہا ہے۔ ہم اس کو کچھ معیوب بات خیال نہیں کرتے۔ مگر چونکہ غالب کے تمام سوانح نگار اس بات پر قصداً کچھ روشنی ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے یہ مختصر سا ریمارک ان کے کیرکٹر پہ کیا گیا ہے۔ لیکن کسی کا دل دکھانے کو نہیں بلکہ اصلیت کے چہرے سے نقاب اٹھانے اور اصل حقیقت کو آشکارا کرنے کے لئے مرزا غالب کہتے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت ساری

دِل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے[1]

غالب کی اُردو فارسی تصنیفات

مرزا صاحب کا کلیات فارسی زبان میں مطبع نولکشور سے مدت ہوئی شایع ہو چکا ہے۔ اس میں غزلیات۔ قصیدے۔ قطعے۔ مثنویات اور رباعیات وغیرہ سب اصنافِ سخن موجود ہیں۔ اور گویا ان کے کمال کا محضر شہادت لکھواتے ہیں۔

اُردو دیوان ۔ اس کا ایک مکمل نسخہ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ حال ہی میں نسخہ حمیدیہ کے نام سے شایع ہُوا ہے۔ چنانچہ سطور بالا میں اسپر کچھ ریویو بھی کر دیا گیا ہے۔ مگر مرزا کے اشعار کے حل کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ اس کے بعض بعض اشعار حضرت طباطبائی صاحب سے بھی درست طور پر حل نہیں ہو سکے حالانکہ نظم صاحب کی شرح دیوان غالب بہت مفصل ہے اور دیگر سب شرحوں سے بہتر خیال کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آسی لکھنوی۔ حسرت موہانی۔ اور نظامی بدایونی کی بھی شرحیں چھپ چکی ہیں۔ اور یادگار غالب میں بھی مرزا کے اُردو فارسی اشعار

[1] اور ضدا کی نسبت کہا ہے ؎ زندگی اپنی اسطرح جو گذری غالب ؎ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے ہیں ؎

کو ذہن نشین کرانے کی اکثر کوشش کی گئی ہے۔ تاہم کچھ اشعار ابھی حل طلب ہیں مثلاً غالب کا ایک شعر ہے ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مَیں اس شعر کو اسطرح حل کرتا ہوں۔ کہ سرِ زلف شدن ایک فارسی محاورہ ہے۔ جس کے معنی افعال و اقوال میں استغنا برتنا ہے (ملاحظہ ہو بہار عجم ۲۵۶ اور پنج آہنگ غالب ۳۴۵) جیسے کہ خوجی نیشاپوری کہتا ہے ؎

امشب جواب ما بسرِ زلف میدہی
ہرگز میان ما و تو ایں گفتگو نبود

پس اُس شعر کے معنی یہ ہوئے کہ اول تو عشاق کی آہ ایسی بے تاثیر ہوتی ہے کہ ایک عمر اس کو اثر ہونے ہی کو چاہیئے۔ پھر اگر دوست کچھ توجہ بھی کرے تو اس کی لاپرواہی ہمارے مدعا کے پورا کرنے میں ضرور دخیل ہوگی۔ اور اس وقت تک ہم جیتے ہی کب رہینگے یہ شعر گویا غالب نے دوبارہ اسی غزل میں یوں باندھا ہے ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائینگے ہم تمکو خبر ہونے تک

میرزا غالب کے دیوان کی وہ تمام شرحیں جو ابتک طبع ہوئی ہیں اور جو میری نظر سے بھی وقتاً فوقتاً گذر چکی ہیں۔ ان میں "بسر زلف شدن" کے اردو ترجمے کی طرف جو اس شعر میں کیا گیا ہے کسی کا خیال نہیں گیا۔ یا کسی شارح کو یہ فارسی محاورہ شاید معلوم نہ تھا۔ اس لیئے اس شعر کی سب شرحیں ناقص رہی اسی طرح مرزا کے اور بھی بیسیوں اشعار تاہنوز حل طلب ہیں۔

عودِ ہندی۔ یہ عام شعرا کے مفید مطلب کتاب ہے۔ اس میں مرزا صاحب اپنے دوستوں اور شاگردوں کے پوچھے ہوئے سوالات کے (جو اکثر شعر و شاعری کے متعلق ہوتے تھے) بڑی قابلیت سے جواب دیتے ہیں۔ اور ان سے مرزا کی شعر فہمی بخوبی واضح ہوتی ہے

اُردوئے معلےٰ۔ سنہ ۱۲۸۵ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے سنہ ۱۲۴۰ھ میں کتاب فسانۂ عجائب لکھی گئی تھی پس اردوئے معلےٰ سے بہتر مجموعہ اردو نثر بجز فسانۂ مذکور کے اس زمانے تک عموماً نہیں مرتب ہوا تھا

کتاب اُردوئے معلیٰ اب مکمل شائع ہو چکی ہے۔ انگریزی زبان میں پے پیز صاحب کی ڈائری (Pepys Diary) سے بیسیوں تاریخی اور علمی مطالب حل ہوتے ہیں۔ اسی طرح عود ہندی اور اردوئے معلیٰ سے بھی اول تو غدر کا سارا حال یعنی صحیح صحیح مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ پھر غالب کی سوانحعمری ایسی مکمل ان خطوں میں موجود ہے۔ کہ نظامی بدایونی نے ان کو جمع کر کے نکاتِ غالب نامی ایک رسالہ شائع کیا ہے۔ اس میں مرزا کے جتنے حالات لکھے ہیں۔ یادگار غالب اور آبِ حیات میں ان سے کچھ زیادہ ضروری باتیں قلمبند نہیں ہوئیں۔ غرض اردوئے معلیٰ سینکڑوں ادبی۔ علمی اور تاریخی نکتے بھی مندرج ہیں۔ مثلاً تاریخ زبانِ اردو میں جس اُردو بازار کے متعلق بتایا جاتا ہے۔ کہ یہ اسی کے نام پر اردو کہلاتی ہے۔ اس بازار کی نسبت مرزا غالب مرحوم اُردوئے معلیٰ میں۔ لکھتے ہیں۔ کہ وہ ایام غدر ہی میں برباد کر دیا گیا تھا۔ اسیطرح غدر کا ہنگامہ ہوا تو دلی کے مسلمانوں پر دو تین سال تک برابر مارشل لا سرکار کی طرف سے عاید رہا۔ حالانکہ لکھنؤ میں اس کے برعکس ہندوؤں پر کچھ سختی کی گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ مولانا غالب کے

یہ تاریخی و علمی خطوط سلسلہ وار - مع سن و سال اور تاریخ کے شائع ہوں
اور ان کے مضامین کی ایک فہرست بھی اس کتاب کیساتھ درج کر
دی جائے۔ تو یہ اس قدر مفید ثابت ہوگی کہ شعرا - ایام غدر کے مورخ
عام تذکرہ نویس و ادیب اس سے بہت مستفید ہو سکینگے - سب جانتے
ہیں کہ جسطرح مرزا کا منظوم کلام ہر شخص کی تقلید سے ہمیشہ بالا رہا ہے -
اس کی یہ اردو نثر بھی آجتک کسی کے بس کی چیز نہیں ہوئی - لہذا
مرزا کی سی اُردو نظم و نثر گویا مرزا ہی کی ذات پر ختم ہو چکی ہے -
قاطع برہان - لطائف غیبی - تیغ تیز - پنج آہنگ - اور سبد چین
وغیرہ مرزا کی فارسی تصنیفیں ہیں جنکا بیان یادگار غالب میں کیا گیا
ہے - ان کے علاوہ مہر نیمروز اور دستنبو بھی مرزا کی فارسی نثر کی تاریخی
تصنیفیں ہیں - لیکن ہم ذیل میں مرزا کی ایک ایسی اردو فارسی
تصنیف کا حال درج کرتے ہیں - کہ جس کی طرف مولینا حالی اور آزاد
تو کیا بلکہ اور کسی حال کے غالب پرست کی نظر توجہ بھی ابتک منعطف
نہیں ہوئی - حالانکہ مناسب تو یہ تھا کہ . . . .
. . . . . جہاں غالب کے پنج آہنگ کا تذکرہ اس کی

سوانحعمریوں میں عموماً گیا گیا ہے۔ وہاں اس کتاب کا بیان بھی جس
کا نام قادر نامہ غالب ہے ضرور درج ہوتا۔ یہ ایک چھوٹا سا رسالہ
امیر خسرو کی خالق باری کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ مرزا غالب کو اس
کتاب کی وساطت سے وہ خالص فارسی طلبا کو سکھانا مقصود
تھی۔ کہ جس کو عجمی ناآمیختہ بہ تازی کے نام سے ظاہر کیا جاتا ہے چنانچہ
اسکا نمونہ کلام یہ ہے ؎

پالن ہار خدا رب مالک، رسول پیمبر پیک ہے سالک
فرقان قرآن نسخہ ہے کتاب ونگ ہی زیرہ فوری ہے شتاب
قلقہ حقہ آتش ہے آگ بز ہے بکری شیر ہے باگ
فیل ہے ہاتھی اسپ ہی گھوڑا بسیار بہت اندک ہے تھوڑا
بحر ہے دریا موج ہے لہر گاؤں ہے قریہ بلد ہے شہر

یہ اشعار خسرو کی خالق باری کو یاد دلاتے ہیں۔ لیکن اس کی ابتدا
جسطرح کی گئی ہے اس کی بحر دوسری ہے۔ مثلاً ؎

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا ہے نبی مرسل پیمبر رہنما
پیشوائے دین کو کہیئے امام اور رسول اللہ کا قائم مقام

ہے صحابی دوست خالص ناب ہی | جمع اسکی یاد رکھ اصحاب ہے
بندگی کا ہاں عبادت نام ہے | نیک بختی کا سعادت نام ہے

مرزا غالب نے اپنی شوخی طبع کو اس درسی قاعدہ میں بھی نظرانداز نہیں کیا - اور لڑکوں کے دل بہلانے کو دو ایک اردو غزلیں اس میں لکھدی ہیں - جن میں ایک کا یہ شعر ہے ؎

شعر کے کہنے سے کچھ حاصل نہیں ؛ مانا لیکن ہمارا دل نہیں،

پھر اسی غزل میں آگے جا کر لکھتے ہیں ؎

کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار ؛ آج ہنستے آپ جو کھل کھل نہیں

وہ دوسری غزل یہ ہے ؎

صبح سے دیکھینگے رستہ یار کا | جمعہ کو وعدہ ہوا دیدار کا
وہ چراوے باغ میں میوے جسے | پھاند جانا یاد ہے دیوار کا
پل ہی پر سے پھیر لائے ہمکو لوگ | ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا
شہر میں چھڑیوں کے میلے کی ہے دھوم | آج عالم اور ہے بازار کا
لال ڈگی پر کرے گا جا کے کیا | پل پہ چل ہے آج دن اتوار کا
گر نہ ڈر جاؤ تو دکھلاؤں تمہیں | کاٹ اپنی کاٹھ کی تلوار کا

واہ بے لڑکے پڑھی اچھی غزل   شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا

مرزا نے قادر نامہ کو جس غرض سے لکھا تھا۔ اسکو انہی غزلوں میں ایک جگہ ظاہر بھی کیا ہے یعنی سے

جسنے قادر نامہ سارا پڑھ لیا   اسکو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

یہ آمد نامہ کونسی کتاب تھی۔ راقم اوراق نے اسکو ایک مکتب میں قریباً چالیس اکتالیس برس ہوئے پڑھا تھا۔ جسکا یہ نمونہ ہے۔

ارتفاع	افراخت	افراختہ است	افراختہ بود	مے افرازد	خواہد افراخت	بلند کش-اونچا کر
عفا	آمرزید	آمرزیدہ است	آمرزیدہ بود	مے آمرزد	خواہد آمرزید	بخشش-بخشنا

لیکن اب تو نہ قادر نامہ غالب کی کچھ حاجت ہے نہ کسی آمد نامہ کی کیونکہ عام لوگوں کا میلانِ طبیعت ہی زبان فارسی کیطرف نہیں رہا

غالب کی مسلسل نظمیں

اخلاقی نظموں میں غالب کی بہترین نظم ایک سہرا ہے جو پہلے درج کیا جاچکا ہے۔ ذوق نے جو سہرا لکھا تھا۔ وہ اس کو دیکھکر ہی تصنیف کیا تھا۔ دوسری مسلسل نظم غالب کی ایک قطعہ ہے جو ایک چکنی ڈلی کی تعریف میں فی البدیہ لکھا گیا تھا۔ تیسری نیچرل نظم غالب کی بزبان اردو

وہ غزل ہے جو اس نے عارف کی وفات پر لکھی تھی۔ انہی دو آخر الذکر نظموں کو یہاں درج کیا جاتا ہے کیونکہ انکی باقی مسلسل نظمیں چنداں لحاظ کے قابل نہیں[1]

چکنی ڈلی کی تعریف

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بہ بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

مہرِ مکتوب عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

مسی آلودہ سرِ انگشت حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے
خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلا کہیے

[1] ایک مثنوی آم کی تعریف میں بھی مگر وہ کچھ اچھی نہیں۔

حجر الاسود دیوار حرم کیجیے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اسکو اگر سمجھیے قافِ تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز — میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے — کیوں اسے نکتۂ پرکارِ تمنا کہیے

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے — کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

۲۔ مرثیۂ عارف (غزل کی صورت میں)

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسیگا — ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملینگے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھہ سی تمہیں نفرت سہی نیرّ سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش — کرنا تھا جواں مرگ گزارہ کوئی دن اور

ناداں ہیں جو کہتے ہیں کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

امیر خسرو اور غالب میں مشابہت

یہ دونوں قوم کے ترک اور فارسی گو شاعر تھے۔ ایک نے ابتدائے زبان اردو میں اور دوسرے نے انتہائے زبان اردو میں اس زبان کو بڑی وسعت دلائی ہے۔ اس لئے انکے حالات زندگی جسقدر مشترک ہیں وہ ایک تعجب خیز امر ہے چنانچہ اسی مضمون کو سطور ذیل میں دونوں کا مقابلہ کرکے دکھایا گیا ہے :۔

مرزا غالب	امیر خسرو
آگرہ میں پیدا ہوئے	پٹیالی علاقہ آگرہ میں پیدا ہوئے
ایبک ترک تھے	لاچین ترک تھے
۹ برس کی عمر میں باپ نے وفات پائی	سات برس کی عمر میں باپ مرگیا۔
آگرہ سی دلی پہنچکر مستقل سکونت اختیار کی	آگرہ سے دلی پہنچکر مستقل سکونت اختیار کی

غالب	خسرو
ایک مرتبہ کلکتے گئے	ایک مرتبہ بنگالہ گئے
فارسی اور ترکی خاندانی زبانیں تھیں	فارسی اور ترکی خاندانی زبانیں تھیں
طفولیت میں شعر گوئی کا شوق ہوا تھا۔	طفولیت میں شعر گوئی کا شوق ہوا تھا
پہلا تخلص اسد تھا پھر غالب رکھا	پہلا تخلص سلطانی تھا پھر خسرو رکھا
دلی سے رامپور گئے گھبرا کر واپس آئے۔	دلی سے باہر جا کر پریشان ہوتے تھے
دشمنوں کے ہاتھ ایک دفعہ محبوس ہوئے	ایک لڑائی میں دشمنوں نے قید کر لیا
قادر نامہ تصنیف کیا آدھا فارسی آدھا اردو	خالق باری لکھی۔ آدھی ہندی آدھی فارسی
فارسی نظم و نثر خوب لکھی۔	فارسی نظم و نثر خوب لکھی
اردو غزلیں بہت اچھی لکھیں۔	ہندی یا اردو اشعار بھی اچھے لکھے
اردوئے معلیٰ نثر میں لاجواب لکھی	اعجاز خسروی نثر میں لاجواب لکھی
زبان فارسی کا آخری بہترین ہندوستانی نژاد شاعر ہے	زبان فارسی کا پہلا بہترین ہندوستانی نژاد شاعر ہے
ہنگامۂ غدر میں سخت مصیبت برداشت کی	تیموری حملوں سے سخت اذیت اٹھائی
وفات پا کر دلی میں دفن ہوئے۔ قبر موجود ہے	وفات پا کر دلی میں دفن ہوئے۔ قبر موجود ہے

مرزا غالب کا مرثیہ

ایک غزل میں مرزا نے لکھا تھا ؎

وحشت و شیفتہ مرثیہ لکھینگے شاید مرگ غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں۔

مرزا کی یہ پیشین گوئی اگرچہ پوری نہیں ہوئی کیونکہ وحشت اور شیفتہ نے کوئی مرثیہ غالب کی وفات پر نہیں لکھا۔ مگر مولینا حالی۔ مجروح اور سالک دہلوی نے جو مرثیے لکھے ہیں وہ تینوں بےنظیر اور بےمثل ہیں۔ اور مرزا غالب کی دلی تمنا کو پورا کرتے ہیں ہم ان تینوں شاعروں کے مرثیوں میں سے جو ایک ہی بحر میں ہیں اور یکے بعد دیگرے لکھے گئے ہیں ایک ایک بند یہاں نقل کرتے ہیں کیونکہ ادب اردو میں ان سے بہتر مرثیے کسی اور شاعر کی وفات پر ہرگز قلمبند نہیں ہوئے۔ بغور ملاحظہ ہوں

مولینا حالی

نقد معنی کا گنجداں نہ رہا خوان مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اس کے گئی بہار سخن اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
ہوا اک ایک کارواں سالار کوئی سالار کارواں نہ رہا
رونق حسن تھا بیاں اسکا گرم بازار گلرخاں نہ رہا
عشق کا نام اس سے روشن تھا قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اہل ہند اب کرینگے کس پہ نازہ رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نام ملوک   بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا،
کوئی ویسا نظر نہیں آتا،   وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
رشک عرفی و فخر طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

۲۔ میاں مجروح

تھی جو انکو مزاج میں تہذیب   وہ جہاں میں نہیں کسی کو نصیب
انسے دیکھا کبھی نہ فعل عبث   اس سے آگاہ ہیں سب بعید و قریب
صلح کل کا رکھا تھا وہ برتاو   تھے وہ دشمن کے بھی نظر میں حبیب
تھی نہ اک بات لطف سے خالی   یہ بھی اک بات تھی عجیب و غریب
گفتگو میں عجب فصاحت تھی   ہوتے تھے محو جسکو سن کے ادیب
تھا ہر اک بات کا نیا انداز   ہر سخن کی تھی اک نئی ترکیب
خوش ہی جاتا تھا ان سے ہر غمگیں   تھے مگر آپ خوشدلی کے طبیب
ان کا تابوت دیکھہ باحسرت   یہی کہتا تھا ہر امیر و غریب
رشک عرفی و فخر طالب مرد
اسد اللہ خاں غالب مُرد

۳۔ قربان علی بیگ سالک

اب نہیں ہوش میں رہا کوئی
کیا مرا حال پوچھتا کوئی

کوئی آزارِ چرخ کا گلہ مند
شاکیِ بختِ نارسا کوئی

چشمِ تر سے ہے کوئی طوفاں خیز
ضبط سے ہے بھرا ہوا کوئی

ہے کسی کی فغاں شرر افشاں
سوزِ پنہاں سے جل گیا کوئی

جو نہ مانگے کبھی کوئی مہجور
لب پہ لاتا ہے وہ دعا کوئی

اپنے عالم میں مبتلا ہے جہاں
کوئی دشمن نہ آشنا کوئی

نہیں چھٹنے کی زندگانی تک
غم کی سمجھا نہ انتہا کوئی

راز اتنا تو کھول دے مجھ پر
نہیں اسرار داں رہا کوئی

اب یہ کیوں آسماں کو ہے گردش
فتنہ اس سے بھی ہے سوا کوئی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

غرض جناب سالک۔ مجروح اور حالی تینوں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ انہوں نے حقِ شاگردی خوب ادا کیا ہے۔

میرزا نوشہ

غالب کو مرزا نوشہ اسلئے کہتے ہیں کہ ان کے والد اپنے خسر کے ہاں خانہ داماد ہوکر الور میں بیٹھ گئے تو وہ مرزا دولہا کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کو بھی نواب الٰہی بخش خاں معروف نے اپنا داماد بناکر آگرہ سے دلی بلوالیا۔ تو گویا اپنے والد ہی کی تقلید میں یہ مرزا دولہا کے بجائے مرزا نوشہ کے خاندانی اور عرفی نام سے موسوم کئے گئے۔

تخلص اسد - تذکرہ آبحیات میں مرزا کے حالات تمام تر انکی اردوئے معلیٰ ہی سے منتخب ہوکر قلمبند ہوئے ہیں۔ اس لئے آزاد نے ان کے حالات لکھنے میں اس رنگینی یا تکلف عبارت سے کام نہیں لیا۔ جو میر و سودا۔ ذوق یا انشاء اللہ خاں کے حالات سے مخصوص ہے۔

مرزا نے اپنا تخلص اسد یا نوشہ ۱۲۴۵ھ میں بالکل ترک کر دیا تھا یا جسطرح فارسی اور اردو نظموں میں علیحدہ علیحدہ دو تخلص برتنے کا رواج شعرا میں پایا جاتا ہے

لہ چنانچہ غالب کے شاگرد نواب مصطفےٰ خاں کا فارسی میں تخلص حسرتی اور اردو میں شیفتہ تھا۔

انہوں نے بھی اردو میں دو چار برس شعر کہکر فارسی کہنا شروع کیا تو غالباً ایسا ہی کیا۔ اسکی تصدیق نسخہ حمیدیہ دیوان غالب کے دیباچے سے ...... ہوتی ہے۔ کہ ۱۲۳۷ھ میں انہوں نے اپنے دیوان کی نقل نواب فوجدار خاں کو ارسال کی تو اسمیں کاتب نے یہ لکھا کہ دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم وغیرہ وغیرہ۔ وہ خود بھی نواب علائی کو ایک خط سنہ ۱۸۶۴ء میں لکھتے ہیں کہ پچاس برس ہوئے ہیں نے اردو شعر کہتے کہتے ابھی دو چار برس ہوئے تھے کہ اپنا تخلص اسد کے بجائے غالب رکھ لیا۔ اس لئے مرزا امانی کے اس شعر سے

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی ؛ میرے شیر رحمت ہو تجھ پر خدا کی

کے متعلق جو روایت چلی آتی ہے اور اس سے آزاد کو یہ دکھانا مقصود ہوا[1] کہ مرزا صاحب عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونیکو مکروہ سمجھتے تھے بالکل غلط ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انہوں نے اپنا تخلص اردو میں اسد اور فارسی میں غالب رکھا تھا۔ پھر جب اپنے تمام خویش و اقارب کا مذہب یعنی سنت و الجماعت چھوڑ کر وہ شیعہ ہو گئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہ کے خاص لقب یعنی اسد اللہ الغالب کی رعایت سے اپنا تخلص بھی غالب رکھ لیا اسکے علاوہ ان سے کچھ پیشتر ایک نواب اسد اللہ خاں عرف طالب جنگ بھی فارسی میں غالب تخلص کیا

[1] آب حیات صفحہ ۴۶۶

کرتے تھے۔ یہ بھی نواب اسد اللہ خاں ناظم جنگ متخلص بہ غالب بنگئے۔ مرزا کا
ایک خط رسالہ معارف نمبر ۵ جلد ۶ میں شائع ہوا ہے جو سید ابو محمد جلیل الدین
صوفی کے نام لکھا گیا تھا۔ اسمیں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ایام شباب میں
بحر طبع روانی پر تھا۔ جی میں آیا کہ غزوات ذوالفقار کہنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ
گویا انہوں نے زبانِ فارسی کی محبت اور اہل ایران کے عام مذہب کی
تقلید میں جو اکثر امامیہ ہوا کرتا ہی۔ اپنے تخلص میں یہ تغیر پسند کیا۔ اور شیعوں
میں بھی وہ فرقہ اللہی کے پیرو ہوئے جیسا کہ فرمایا ہے ؎

منصور فرقہ علی اللہیان منم ؛ آوازہ انا اسد اللہ برافگنم

اسلیئے کہ رفتار و گفتار کی مطلق العنانی میں جیسا کہ اس خاص تشیعی فرقے کا
دستور ہی۔ مرزا پر کسی کو گرفت کرنیکا کچھ امکان نہ ہوسکے۔ واللہ اعلم بالصواب

شغل شعر و شراب۔ غالب کی تمام عمر شعر و شراب کے مشغلوں اور
بدمستی و مدہوشی میں گزری۔ چنانچہ منٹگمری صاحب کی تعریف میں ایک قصیدہ
فارسی زبان میں لکھا ہے۔ اس میں بھی اشارہ کیا ہے ؎

ہوس کار دگر نیست بجز شعر و شراب ؛ اینت حرفے کہ لبم بالب ساغر دارد

اس لئے شیفتہ کے تذکرہ گلشن بے خار کے جواب میں جو تذکرہ نغمہ عندلیب

لکھا گیا تھا۔ اسمیں غالب کے کیرکٹر کے متعلق جو زہر اگلا گیا ہے۔ اور جن باتوں کو کھلم کھلا لکھا ہے حالی نے یادگار غالب میں انہی باتوں کا ایک دبی زبان سے اقرار کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اتنے بڑے شاعر کا کریکٹر اچھا نہیں تھا۔

غالب کی دقت پسندی ۔ مرزا صاحب بہت دقیق اور مشکل شعر کہا کرتے تھے مگر غضب یہ ہے کہ بعض جگہ تعقید کے سبب ان کا سمجھنا ہی سخت دشوار بلکہ غیر ممکن ہو جاتا ہے انہوں نے خود بھی اپنے کچھ اشعار کی تشریح اردوئے معلے اور عود ہندی میں درج کرائی ہے مگر وہ بعض لوگوں کے نزدیک تسلی بخش نہیں ہے اسی لئے عوام میں مشہور ہو گیا کہ غالب سرور شراب میں شعر کہا کرتے تھے جب صوفی ہوتے تو خود بھی اپنے شعروں کو سمجھ نہ سکتے تھے چنانچہ مولوی نذیر احمد دہلوی کی سوانحعمری حیات النذیر میں مولوی صاحب ہی کی زبانی لکھا ہے کہ مرزا صاحب فارسی نہ آمیختہ بہ تازی لکھا کرتے تھے۔ اسپر انوکھے استعارات۔ اچھوتی تشبیہات اور لفظی تعقیدات سے کلام مشکل ہو اہی چاہے۔ ایک انہی کے ایک شعر کا مطلب ان سے پوچھا گیا تو کچھ دیر تامل کر کے فرمایا کہ بھئی اسوقت تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا لکھ گیا۔ غرض ۱۷ ستمبر ۱۸۸۰ء کو مولانا حالی نے ایک خط مولوی محمد حسین

آزاد کے نام لکھا ہے (ملاحظہ ہو مکتوبات آزاد صفحہ ۲۴۸) جو تذکرہ آبحیات
کے طبع ثانی کئے جانیکے متعلق ہے۔ اسمیں حالی صاحب غالب کے آخیر زمانہ
کی کچھ صاف اور سہل غزلوں کا حوالہ دیکر انکے یہ پتے دیتے ہیں (۱) اجلال اچھا ہے
کمال اچھا ہے (۲) ظہور کی بطیوکی (۳) دوانہ ہوا۔ ادانہ ہوا (۴)، یار ہوتا
انتظار ہوتا (۵) بر نہیں آتی نظر نہیں آتی پھر اسی خط میں سائل کے
خط کے جواب میں مرزا کے ایک شعر "کون جیتا ہے تری عمر کے سر ہونے تک"
کی تشریح حالی نے یوں کی ہے کہ وصل کی تیاری کے وقت جو معشوقہ کی
زلفیں سر گوندھنے کے لئے کھلتی ہیں دیکھیے وہ وقت کب آتا ہے وغیرہ
لیکن یہ مشکل شعر جس کے سمجھنے میں
مولانا حالی اور آزاد دونوں عاجز تھے۔ اسکی تشریح ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔
در اصل غالب کی مشکل گوئی کا سبب تعقیدات لفظی ہیں یا افکار اردو زبان
میں متاخرین دقت پسند شعرائے فارسی کا تتبع ہے۔ جو ایک سلیقے سے
نہیں کیا گیا۔ لہذا وہ اپنے اس نقص سے جب باخبر ہوئے تو اخیر عمر
میں سہل گوئی پر اتر آئے۔ اور پھر بہت اچھا کہا۔

مرزا علائی سے منظوم خط وکتابت۔ مرزا غالب کو آموں سے بڑی رغبت تھی

کلکتے گئے تو وہاں برابر دو برس رہے اور اس شہر سے اسقدر مانوس ہوگئے کہ اسکو جب چھوڑا تو پھر اسکی یاد میں یہ چند شعر لکھے ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں[۱] ؎ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

پھر بنگالہ کے آم یاد آئے تو لکھا ؎

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد ؎ غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

اسیطرح ایکدفعہ نواب علائی نے میرزا کو رامپور میں دعوت دیکر خاص طور سے بلوایا انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ وہاں آم نہیں ہیں۔ اور یہ منظوم خط لکھا۔

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے | پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم | کہ دلی کو چھوڑیں لہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مقلوب جان | نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں | ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول | وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت ہے بھیڑ کا ریشہ دار | کہو اسکو ہم کھا کے کیا خط اٹھائیں

اس خط کا جواب نواب علائی نے بھی نظم ہی میں دیا ؎

خوشی ہے یہ آنے کی آپ کے | کہ باہم پئیں بادہ اور آم کھائیں

[۱] تمام قطعہ دیوان غالب دیکھیں۔

سر آغاز موسم میں کیا خوب ہو / جو دلی سی حضرت لہارو کو آئیں

عجب لطف ہی یہاں کی برسات ہیں / کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں

سر دلی کے وہ ڈاک پر سبز آم / وہ دلی سے انگور ہر شام آئیں

کریں حکم باورچیوں کو کہ ہاں / ابھی جا کے ہر چیز جلدی پکائیں

وہ لیں باغ سے جا کے املی کے پھول / وہ جنگل سی کڑوی کریلے منگائیں

وہ بے ریشہ بکری کا لحم طری / کہ کیا کیا اسے کھا کے ہم حظ اٹھائیں

کہیں انکو بے مہر و کاہل اگر / لہارو وہ اسبات پر بھی نہ آئیں

بحوالہ معارف

حکیم محمد مومن خاں مومن

ولادت سنہ ۱۸۱۷ء وفات سنہ ۱۸۵۲ء

وہ انگریزی تذکرہ اردو شعرا کا جسکا ہم اوپر بھی کئی جگہ حوالہ دی چکی ہیں اسمیں لکھا ہی کہ حکیم مومن خاں زمانہ موجودہ کا بہترین ریختہ شاعر ہی۔ جو فارسی نظمیں بھی لکھا کرتا ہی وہ بہت عمدہ طبیب بھی ہی۔ حقیقت میں وہ غالب اور ذوق دونوں نی اپنے ابتدائے زمانہ شعرگوئی میں بہت اچھا شعر کہتی تھی۔ اور انکا دیوان جب سنہ ۱۲۴۳ھ میں شائع ہوا۔ تو انکی عمر صرف ۲۹ سال کی تھی چونکہ ایسی کم عمر میں اور کسی ریختہ گو شاعر کا دیوان اسقدر خوبیوں پر مشتمل نہیں دیکھا گیا۔ حضرت مومن بھی

لہ اس تذکرے میں انکے نجومی ہونیکا کچھ ذکر نہیں جسکے متعلق، انکی تذکرہ نویسوں نی بہت مبالغہ کیا ہی۔

بے مثل شاعر اور صاحب ایجاد ہیں۔ انکے حالات آزاد نے ابحیات میں درج کرنے سے دریغ کیا پھر اہل قلم نے انکی سخت مخالفت کی۔ تو اسکو مومن کے دوستوں سے لکھوا کر قلمبند کیا۔ مرزا علائی کے ایک خط سے واضح ہوتا ہے کہ مومن زبان عربی بھی کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے انہوں نے فارسی عبد اللہ خاں علوی سے جو عدیم المثال عالم تھے تحصیل کی تھی۔ ان کا ایک دیوان زبان فارسی میں بھی ہے جس کا پتہ حالی کے خط سے چلتا ہے۔ جو انہوں نے آزاد کو تحریر کیا تھا۔

ایجاد مومن۔ مومن کا کمال اردو نظم میں وہ دقت پسندی ہے جو لفظوں کے ہیر پھیر سے کلام میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کے باقی حالات تذکرۂ آبحیات میں ملاحظہ فرماویں۔ مولانا شوکت میرٹھی نے مومن کی نازکخیالی اور دقت شعاری پر مخزن اکتوبر و نومبر ۱۹۱۲ء میں بالتفصیل لکھا ہے جسکو بعدم گنجائش نظرانداز کیا جاتا ہے۔

انیس و دبیر۔ چونکہ اردو نظم میں ابتک معیار کمال غزلگوئی تھا۔ اسلئے یہ دونوں صاحب کمال اس دائرہ میں نہیں آ سکتے۔ ہمارے نزدیک وہ اخلاقی اور مسلسل نظموں کی تصنیف کے تعلق سے زمانۂ موجودہ کے اولین شعرا میں داخل ہیں۔ بلکہ دبیر تو ۱۸۷۴ء میں فوت ہوا جبکہ حالی و آزاد کی بدولت نیچرل شاعری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اس لئے انکا حال اعجاز سخن حصہ دوم میں لکھا جائیگا۔ حصہ اول تمام شد۔

شعلہ سوتے نہ عشق میں جب تک وہ مہربان نہ ہو۔ بلائے جان ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا
بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسے۔ اچھا نہ کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے۔ آب حیات

ضمیمہ جات

۱۔ انشاط الثانیہ

سطور ذیل میں وہ مشاہیر شعرائے اردو معہ نمونہ کلام درج ہیں۔ جو اگرچہ مثل مسبوق الذکر شعرا میر و سودا۔ ذوق و غالب وغیرہ صاحب ایجاد نہیں ہیں مگر ان کے رتبہ استادی میں ہرگز کچھ شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا لہذا بغرض تکمیل تذکرہ ان سے تعارف ہونا نہایت ضروری خیال کیا گیا ہے۔

سراج الدین سراج دکنی ولی کا ہمعصر تھا۔ کتاب مجمع الاشعار میں اس کی کچھ سالم غزلیں موجود ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے

چلی سمت غیب سے وہ ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا

مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

ظہورالدین حاتم۔ ولادت ۱۱۱۱ھ وفات ۱۲۰۷ھ۔ سودا اور رنگین کا استاد۔ پہلے عموماً ہندی زیادہ اور فارسی کم ملا جلا کر کہتا تھا۔ اور خوبی کلام ابہام گوئی تھی۔ مگر دیوان ولی سے متاثر ہو کر اپنے کلام کی اصلاح کی یعنی ہندی و پنجابی بہت کم اور فارسی زیادہ اردو میں ابہام گوئی بہ طفیل حاتم سے شروع ہوا تو ناجی۔ احسن۔ آبرو۔ مضمون اور یکرنگ وغیرہ نے اس میں کمال پیدا کیا۔ پھر [illegible] آرزو کے مشورہ [illegible]

یہ رنگ اختیار نہیں کیا۔ متاخرین میں امانت نے ایہام گوئی کو زندہ کرنا
چاہا۔ مگر کسی نے اس کی تقلید نہیں کی۔ (تذکرہ خمخانۂ جاوید جلد دوم۔ اور
آب حیات میں حاتم کے حالات مفصّل لکھے ہیں) حاتم بطرز قدیم یعنی ایہام
گوئی ؎

جب سنا موتی نے تجھ دنداں کے موتی کا بہا
آب میں شرمندگی سُوں ڈوب جوں موتی بہا
لب تمہارے سُرخ ہم نے تاڑ کر پوچھا تھا مول
جوہری کہنے لگے یہ لعل ہے گا بے بہا۔

حاتم برنگِ جدید ؎

ہجر کی زندگی سے موت بھلی — کہ جیے سب کہیں وصال ہوا
کئی عالم کیے ہیں قتل اس نے — گرچہ کیا ایک کا تھا حاتم بچارا

میر نے نکات الشعرا میں حاتم کو مرد جاہل و متمکن و دیوانشا لکھا ہے
حاتم کا ایک شعر ہے ؎

ہائے بیدرد سے ملا کیوں تھا
آگے آیا میرے کیا میرا،

میر صاحب فرماتے ہیں یہ شعر یوں ہونا چاہیئے ؎

مبتلا آتشک میں ہوں اب میں
آگے آیا مرے کیا میرا،

سراج الدّین علیخاں آرزو یا خان آرزو۔

ولی کی تقلید پر دلی میں طرز جدید کا رواج ہوا۔ تو خان آرزو جو زبان فارسی کے جید عالم

ا؂ یہاں بہا اور لگیا یا لگا بہ طریقہ زبان پنجابی استعمال ہوئے ہیں۔

یہ بہا بھی پنجابی ہے۔

تھے۔ سب نے ان کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے وہ سب کتابیں ادب فارسی کی شرح کر ڈالیں جو استعداد زبان فارسی کے لئے نافع تھیں۔ مثلاً خیابان شرح گلستان، سکندر نامہ اور قصائد عرفی وغیرہ کی شرح۔ اور ایک فارسی لغت بنام سراج اللغات اور موہبت عظمٰے وعطیۂ کبرےٰ (جنکی نسبت ان کو یہ خیال تھا کہ خاص طور سے القا ہوئی ہیں) علوم معانی وبیان میں تصنیف کیں۔ ولادت ۱۱۰۱ھ ہجری اور وفات ۱۱۶۹ھ ہجری ہے۔ وہ خاص دہلوی نہیں تھے۔ ۱۱۳۲ھ ہجری میں آگرہ سے دلی آگئے تھے۔ پھر لکھنؤ چلے گئے۔ آب حیات میں لکھا ہے کہ خان آرزو کو اردو پر وہی دعوے پہنچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ منطق پر ہے۔ مگر میری دانست میں یہ قول صحیح نہیں۔ خان آرزو کی اردو آگرہ کی اردو ہوگی۔ اور مظہر جانجاناں، میر تقی میر اور درد یہ دلی کے گویا روڑے تھے۔ فطرتاً خان آرزو سے وہ زبان اردو میں اچھا کہہ سکتے ہونگے۔ البتہ فارسی ادب کے حصول میں ان سے کچھ مشورہ لیا ہو۔ یا استفادہ کیا ہو۔ تو غیر ممکن نہیں ہے۔ انہی شاگردوں کی خاص تعلیم کے لئے تو خان موصوف نے ان درسی کتابوں کی شرحیں اور لغت اور علوم بیان ومعانی کے رسالے لکھے تھے۔ آزاد نے سودا کو بھی خان آرزو کے دامن شفقت میں لے لیا ہے حالانکہ وہ حاتم کے شاگرد اور ایک گونہ اس گروہ سے جس میں میر تقی وغیرہ تھے رقابت رکھتے تھے۔ اسی لئے میر نے جو خان آرزو کے بھانجے تھے۔ جہاں حاتم کو برا بھلا کہا۔ سودا کے متعلق بھی یہ شعر لکھا ہے ؎

طرف ہونا مرا مشکل ہے میرؔ اس شعر کے فن میں
یونہی سوداؔ کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

دراصل فارسی شاعری کا اسوقت خاص چرچا تھا - اور میر تقی میر - درد اور مظہر وغیرہ نے ان کی فارسی قابلیت سے فائدہ اٹھایا - اور ممکن ہے سودا نے بھی اپنا فارسی کلام انکو دکھاکر کچھ اصلاح لی ہو - اور انہوں نے ان کے اردو کلام کو نسبتاً بہتر خیال کرکے اپنی توجہ زیادہ تر اردو شاعری ہی کی طرف مبذول رکھنے کی صلاح دی ہو - غرض خان آرزو سے مظہر درد - میر اور سودا نے فارسی زبان کی تکمیل کی - اور اپنے فارسی دیوان بھی اردو کلام کے ساتھ ساتھ مرتب کیے - تاہم اس تکمیل فن سے ان شعرا کو جو کمال حاصل ہوا اس کا تمام کریڈٹ (افتخار) خان آرزو ہی کو نہیں دیا جاسکتا ۔ خان آرزو کا ایک شعر ہے ؎

آتا ہے ہر سحر اُٹھ تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

اصل شعر بطریق پنجابی تھا ؎ ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو الخ (بحوالہ نکات الشعرا) -

شیخ نجم الدین علیخان آبرو یا شاہ مبارک آبرو - ولادت ۱۱۱۱ھ

وفات تخمیناً ۱۱۶۱ھ گوالیار وطن تھا دلی آیا تو مظہر جانجاناں سے معرکے ہوتے - نارنول بھی رہا ہے - کانا تھا - اشعار ؎

آیا ہے صبح نیند سے اُٹھ رسما ہُوا
جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہُوا

یہ ساری غزل (ملاحظہ ہو آبحیات ص۹۸) اس انداز میں ہے کہ پہلا مصرعہ ہر شعر کا ہندی آمیز ہے اور دوسرا اس وقت کے جدید رنگ میں ہے۔ آبرو کے ان مصرعوں میں جن الفاظ پر خط کھینچا گیا ہے سب پنجابی ہیں۔

پلنگ کو چھوڑ خالی گود سیں اٹھ گئے سجن میتا

اہل پنجاب گو کچھ پہلے عموماً سیں کہتے تھے۔ اب بھی جہاں بولتے ہیں اونہاں سیں یا سوں معنے (میتا) رنج دکھ کائی (کوئی) نہیں سے

۱۔ رستم دل کے دلمیں ڈالے انجھو سوں پانی
دیکھے اگر بھواں کی تلوار کا جھماکا،،

۲۔ چلکیں سورج منے جوں خط شعاع کے شعلے
دیکھو اکھیوں منے یہ لعل جھمک ڈوروں کی

۳۔ آبرو کو نہیں کم ظرف کی محبت کا دماغ،
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے نکتوڑوں کی

۴۔ فاسق کے دل پہ ڈالے جب نفس بد نے بڑکے
رجواڑے کی گلی کا تب جا غبار پھانکا،،

ان چاروں شعروں ہیں چلکیں (چمکیں) انجھو۔ بھواں۔ جھماکا۔ اکھیوں نکتوڑے۔ بڑکے اور رجواڑے صریحاً پنجابی الفاظ ہیں۔

آبرو فرماتے ہیں ۔

لب شیریں پہ ستر نجن گے نہیں خط سیاہ
ڈار چھوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی

کیا شیخ کیا برہمن جب عاشقی میں آویں
تسبی کرے فراموش زنار بھول جاوے

اصحاب پنجاب بولتے چالتے ہیں۔ کونجوں کی ڈار ہے یعنی قطار۔ اور تسبی تو شاید ہر ایک پنجابی کی زبان پر اب تک اسی طرح موجود ہے۔

آبرو نے نفیر کا لٹکا۔ جھڑ بدلی۔ تختہ اوپر چلاوتے۔ یعنی چلاوندے وغیرہ

پنجابی الفاظ بھی نظم کئے ہیں۔ آبرو کا یہ شعر لاجواب ہے ؎

اب دین ہوا زمانہ ساری
آفاق تمام دہریہ ہے

شرف الدین مضمون ۔ سنہ ۱۱۵۷ ہجری میں فوت ہوئے۔ نواب عمدۃ الملک کے دو سال ملازم رہے مگر شرم سے تنخواہ کا تقاضا نہ کیا۔ نواب نے استفسار کیا تو فی البدیہ کہا ؎

عرض حال اپنے سے ہیں اہلِ شرافت بے نصیب
نہیں سخن رکھتے زبان کے بیچ گویا یہ نجیب

یہاں لفظ نہیں کا لہجہ پنجابی ہے۔ اپنے تخلص کی رعایت سے کہا ہے ؎

اگر پاؤں تو مضموں کو رکھوں باندھ
کروں کیا جو نہیں لگتا میرے ہاتھ

مضمون کا ایک مصرع ہے۔ ع

ہس کے پھر دیکھنا قیامت ہے

ایک اور جگہ بھی ہس کے بغیر نون کے لکھا ہے جو خاص پنجابی انداز ہے

محمد شاکر ناجی ۔ وفات سنہ ۱۱۶۸ ہجری۔ راہ چلتے سے الجھ پڑتے تھے۔ اسی لئے ایک تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کو ناجی نہیں ہاجی کہنا چاہیے۔ مگر ناجی پاجی کا جوڑ اچھا رہے گا۔ تاہم اپنی نسبت یہ حسن ظن رکھتے تھے ؎

حشر میں پاکباز ہے ناجی
بدعمل جائینگے سقر کی طرف

؎ محبّت سوں علی کی دیکھ ناجی
ہوا ہے دل مرا اب حیدر آباد
؎ اس کا رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

یہ شعر انہی کا ہے ؎
ان بتوں کو ہم فقیروں سو بھلا کیا کام ہی
یہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہی

احسن اللہ احسنؔ - ایہام گو ہیں۔ ۱۱۳۵ھ ہجری میں نواب سرفراز الدولہ کے ملازم تھے۔ غزلوں کے علاوہ سات مثنویاں اور قصیدے بھی لکھے ہیں۔ ان کا یہ شعر بے مثل ہے ؎
لام نستعلیق کا ہے اس بتِ خوشخط کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اس لام کے
؎ یہی مضمون خط ہے احسن اللہ
کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے

نعیم اللہ نعیم - شاہ حاتم سے اصلاح لیتے رہے۔ قابل شاعر تھا۔ ایک مشاعرے میں حاتم نے اس پر چوٹ کی ؎
جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہے
بدتر اسے خزاں سے بہار نعیم ہے
نعیم نے اس کے جواب میں اسی مشاعرے میں یہ شعر پڑھا ؎
طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے
لب سوال نہیں گر تو ہیچ حاتم ہے

مصطفےٰ خاں یکرنگ - مظہر کا شاگرد اور محمد شاہ کا منصب دار
تھا - ایک مرثیہ میں کہتے ہیں ؎

زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا
گلزار کی نمط ہے بیابان کربلا
کسا نے چلائے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ
دھو ہاتھ زندگی ستی مہمان کربلا
اندھیرہ ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ
ہے سر بریدہ شمع شبستان کربلا

ولہٗ
دل مرا لے گئے جو دبدہا میں پڑے ہو ناحق
کیا سمجھ اس کا کوئی جگ میں خریدار نہیں

دبدہا جسکے معنی تکلیف کے ہیں - ٹھیٹھ پنجابی ہے -

مرزا جانجاناں مظہر ولادت سنہ ۱۱۱۵ ہجری وفات سنہ ۱۱۹۴ ہجری
مثنوی شریف کا شعر ہے ؎

جانِ اوّل مظہر درگاہ شد
جانجاں خود مظہر اللہ شد

شاید اس شعر کی رعایت سے یا اس لئے کہ ان کے باپ کا نام میرزا جان
تھا - اس نے بوجہ فرط محبت ان کا نام جانجاں رکھا تھا - مگر جانجاناں
مشہور ہو گیا - حسرت موہانی نے ان کا مفصل حال تذکرہ اردوئے معلےٰ
میں لکھا ہے اور ان کے شاگردوں کے کلام و حالات بھی قلمبند کئے
ہیں - تذکرہ سرو آزاد میں ان کے فارسی کلام کی بڑی تعریف کی گئی ہے
جو ان کے اردو کلام سے فی الواقع بہتر تھا - اور اب بھی بعض کتب خانوں

میں موجود ہے - ایام پیری کی شکایت کی ہے ؎

نو بہارے عمر رفت و جسم زارے ماندہ است
یادگار آں گلستاں آبشارے ماندہ است
آفتابے رفت زاغوشم ازیں غم چوں ہلال
ایں قدر کاہیدہ ام از من کنارے ماندہ است
جائے رحم است اے ہجوم آہ و اے سیلاب اشک
یادگار از من ہمیں مشت غبارے ماندہ است
شد پریشاں مجمع احباب مدتہا گذشت
ظاہرا زاں فرقہ مظہر نام یارے ماندہ است

مظہر ۱۱۹۴؁ ہجری میں شہید کئے گئے وجہ یہ ہوئی کہ نہ صرف دلی میں بلکہ سنبھل مراد آباد تک پھر پھر کر مذہب تشیع کے خلاف وعظ کہا تہا - (بہ حوالہ تذکرہ میر حسن) اور سینکڑوں کٹر سنی بھی ان کے مرید ہو گئے تھے - جہلا نے انکو محرم کے مہینے میں موقع پاکر قتل کر دیا -

اشرف علیخاں فغاںؔ - وفات ۱۱۸۶؁ احمد شاہ بادشاہ نے ان کو ظریف الملک کوکہ خاں بہادر کا خطاب دیا تھا - طبیعت بہت مضحک پائی تھی - چنانچہ ایک ہندو رئیس گوگی منڈی کا ساند اور ایک حکیم کو گاؤ بگراتی کہا - تو میر صاحب بہی مسکرانے لگے - جگنو میاں کے متعلق جو شعر لکہا تہا وہ آب حیات میں ملاحظہ ہو - ایک پٹھو کی ہجو میں ان کی مثنوی کا سر آغاز ہے ؎

ایک شخص آشنا ہمارے ہیں
نہ ہمارے نہ وہ تمہارے تہے

دل سے وہ آشنا ہیں نگاہ کے
متلاشی ہیں آب و دانے کے

میر عبدالحی تاباں - اسقدر حسین تھے کہ جو شخص انکو دیکھ لیتا - فوراً عاشق ہو جاتا - مگر وہ خود سلیمان نامی ایک طفل ماہ جبین کے دلدادہ تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

سلیمان کیا ہوا گر تو نظر مجھکو نہیں آتا
میری آنکھوں کی پتلی میں تیری تصویر پھرتی ہے

اتنی شراب خوری کی کہ آخر اسی سے قضا کر گئے - تاباں میاں مظہر کے مرید تھے جنکے حق میں ایک دفعہ فرمایا تھا ؎

تمہارے ہجر میں رہتا ہے ہمکو غم میاں صاحب
خدا جانے مرینگے یا جئینگے ہم میاں صاحب

شاہ مبارک آبرو بھی اپنے پیر و مرشد نکہت پر ناز سے یونہی خطاب کرتا ہے ؎

مجھے درد و الم گھیرے ہی نت مرے میاں صاحب
خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں صاحب

تاباں نے شراب و ساقی کے متعلق بعض رباعیاں لکھکر عمر خیام کی روح اردو میں پیدا کی ہے ؎

ہوتا ہوں ترا جو اشتیاق ساقی
بیخود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی
ہے مجھکو خمار شب کا لا صبح ہوئی
شیشے میں جو کچھ کہ مے ہی باقی ساقی

ساقی ہو اور چمن ہو مینا ہو اور ہم ہوں
دلند ؎

باراں ہو اور ہوا ہو سبزہ ہو اور ہم ہوں
ایمان و دیں سے تاباں مطلب کہاں ہے ہمکو
ساقی ہو اور مے ہو دنیا ہو اور ہم ہوں

شیخ محمد قائم چاندپوری۔ وفات ۱۲۱۰ھ ہجری۔ حسرت موہانی نے ان کا مختصر کلام شائع کیا ہے۔ وہ میرؔ اور سوداؔ سے دوسرے درجے پر نہایت قابل شاعر تھے۔ ایک غزل کا مطلع کہا ہے ؎

شوخی سے پہنچے ہے جوں ہند میں طوطی قائمؔ
آگے سودا کے میں لیکر یہ غزل جاوں گا

مگر سودا خود اپنی غزل اس زمین کی کسی اور کے آگے لیجا رہے ہیں یعنی ؎

وہ جو کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب
سامنے ان کے میں لیکر یہ غزل جاوں گا

یہ مشہور مطلع قائم ہی نے اپنی جدت طبع سے قائم کیا تھا ؎

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ایک غزل کے آخری شعر ہیں ؎

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور پھر آپ من گیا
اے گردش زمانہ تیری کجروی کے بیچ
یکسر نواح ہند سے شعر و سخن گیا
سودا تو اپنے حال میں مدت سی مست ہے

وطن گیا

قائم رہا تھا ایک سو اپنے وطن گیا

آزاد نے قائم کا ایک شعر لکھا ہے

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ

اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

(آب حیات صفحہ ۳) مگر قائم کے ہاں بعض الفاظ ایسے نکلتے ہیں جو خالص پنجابی

ہیں مثلاً راہ پینڈے اسے رکھتا ہوں اگر گھیر کبھو،

ہنس کے کہتا ہے مجھے کام ہے اب پھیر کبھو

یہاں پینڈے کا وہ محاورہ ہے کہ ہر شخص جو زبان پنجابی جانتا ہے اسے

بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ بس کر اور برس کر کے ردیف و قافیہ میں ایک شعر کہا

ہے

بہار عمر ہے قائم کوئی دن

اسے جوں گل پیارے کاٹ ہس کر

یعنی ہس کر یہاں پنجابی لفظ مستعمل ہوا ہے۔

قائم شعرائے دہلوی کا مقلد تھا۔ اسی لئے کہتا ہے

شیخ مجھ کو نہ ڈراگور کی اندھیاری سے

ہجر کی کاٹی ہیں میں نے تو شب تار بہت

مگر تذکرہ آب حیات ص۳۴۸ ناسخ کے حالات میں تحریر ہے کہ شیخ صاحب

فرماتے ہیں شہواری کا جو اس چاند کے ٹکڑے کو ہے شوق

چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری ۔۔۔ کا

اس کے متعلق آزاد لکھتے ہیں کہ لکھنؤ والوں کو ٹوکنے کا منہ نہیں ورنہ دلی

میں بچے سے بوڑھے تک سب اندھیری رات بولتے ہیں۔ یہ بھی حضرت آزاد

کی ایک خود ساختہ تحقیقات ہے۔ کیونکہ اندھیری اور اندھیاری دونوں دلی میں

مستعمل ہوئے ہونگے۔ اسی لئے قائمؔ کی زبان پر یہ لفظ چڑھا۔ لیکن اصل اسکی نہ دہلوی ہے نہ لکھنوی۔ پنجابی ہے جس میں ہنیری کہتے ہیں۔ وہی اصلاح پاکر اندھیری اور پھر اندھیاری بن گیا ؎

مسجد سے گر تو شیخ نکالا ہمیں تو کیا
قائمؔ وہ میفروش کی اپنی دکاں نہیں

؎

چرخ کی اطلسی قبا پہ ہمیش
نہیں یہ کہکشاں ہے دانا کیش

یہاں تو نکالا بغیر علامت فاعل رہنے گئے اور ہمیش خالص پنجابی لب ولہجہ ہے۔

محمد میر سوزؔ۔ ولادت ١١٣٤ سنہ ہجری وفات ١٢١٣ سنہ ہجری۔ حسرت موہانی نے ان کا کلام بھی شائع کر دیا ہے۔ ان کے ایک شعر کا مصرعہ ہے ؎

نہیں نکسے ہے مرے دل کی اپاہی گاہی

اسیر سوداؔ نے طنزاً کہا تھا کہ نکسے کا لفظ بچپن میں ہم نے جب سنا تھا کہ لشور کی ڈومنیاں ہمارے ہاں آئی تھیں۔ مگر یہ لشور کی پھبتی سوداؔ کو سوزؔ پر اڑانی نامناسب تھی۔ کیونکہ وہ خود پیشاب کو بہ لہجہ پنجابی پشاب باندھ گئے ہیں۔ چنانچہ گھوڑے کی ہجو میں کہا ہے ؎

بدرنگ جیسے لید و بدبو ہے جوں پشاب

سوزؔ کا سارا کمال شعر خوانی تھی۔ اس انداز سے پڑھتے تھے۔ کہ نقل کو اصل کر دکھاتے تھے۔ خود فرمایا ہے ؎

پڑھتا ہے شعر سوزؔ کے یوں تو سبھی جہاں
اس کا سا سن لو صاحبو لطف بیاں کہاں

ایک غزل میں دنیا کی بے بقا حالت پر اشارہ کیا ہے ؎

[illegible]

ہم نے کون و مکاں دیکھ لیا   پل میں سارا جہان دیکھ لیا
نیستی کے لئے ہی ہستی ہے   ہاں مرے مہربان دیکھ لیا

جعفر علی حسرت ۔ سنہ ۱۲۱۰ھ ہجری میں انتقال ہوا۔ ان کا یہ قطعہ بہت لاجواب ہے ۵

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
کیا ہی ملک روم ہے کیا سر زمین شام ہے
گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجئے زندگی
اس طرف آواز طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہوئے گلگوں کا دور
شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشہ میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو حرص و آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گور غریباں کی طرف
جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کے لگے کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ مال و حشمت و دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

میر غلام حسین ضاحک ولد عزیز اللہ۔ میر انیس کے دادا اور میر حسن کے باپ تھے۔ غزل و ہزل دونوں میں کما حقہٗ قدرت حاصل تھی۔ بڑے ظریف الطبع شاعر تھے

۵ سنہ ۱۱۹۶ھ میں فیض آباد میں تھے۔ (حیات انیس اثہری)

فارسی بھی عموماً کہتے تھے۔ انکی غزل ۴۰۔۔۔۵۰ شعر کی ہوتی تھی مگر اب دو ہی شعر متداول ہیں ؎

در پیش اگر روز اجل آہ نہ ہوتا　　قصہ شب فرقت کا جو کوتاہ نہ ہوتا
کیا دیجئے اصلاح خدائی کو وگرنہ　　کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

میر غلام حیدر مجذوب ۔ سودا[۲] کے متبنے بیٹے تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

خاطر میں کوئی لاوے میرا سخن کہ مجھ کو
سودا کا متبنے بیٹا مجذوب جانتے ہیں

دو دیوان یادگار چھوڑے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

اشراف یا کمینہ طلبگار ہو کوئی　　دونگا اسی کو دل جو طرحدار سا کوئی

شیخ ہدایت اللہ ہدایت ۔ سنہ[۱] ۱۲۱۵ھ میں وفات پائی۔ درد کے شاگرد اور انہی کے انداز میں کہتے تھے ؎

اے ہدایت شب جوانی کا　　کچھ ہوا تجھ پہ ماجرا روشن
صبح پیری نمود ہوئی تیری　　چل مسافر کہ دن ہوا روشن

سید محمد اثر ۔ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ مثنوی خواب و خیال لکھی۔ حالی مقدمہ شاعری میں فرماتے ہیں۔ کہ اسی مثنوی سے نواب مرزا شوق نے اپنی مثنویوں میں استفادہ کیا۔ یہ بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ میر اثر کی مثنوی کا یہ نمونہ ہے ؎

ناک تیری عجب سجیلی ہے　　پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے
ناک ہے یا کہ ایک طوطا ہے　　چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

۱؎ ہوتی کا یہ انداز صاف پنجابی ہے　۲؎ ۱۲۱۵ھ میں بقید حیات تھے

نتھنے لیسے تیرے پھڑکتے ہیں ۔ جانور وحشی جوں بھڑکتے ہیں
کیا خوش آیندہ کلائی ہے ۔ اس کو دل لینے کی کل آئی ہے

میر درد قریب المرگ ہوئے تو ان سے سجادہ نشینی کی بابت پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا ؎

موت کیا ہم سے فقیروں ہی کو تجھ لینا ہے ۔ مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں
تا قیامت نہیں مٹنے کے دل عالم سے ۔ درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

شیخ قلندر بخش جرأت ۔ ان کا کلام بھی اختصار کر کے حسرت موہانی نے چھپا دیا ہے۔ ان کے کلام میں حسن و عشق کے معاملات اور شعراء سے زیادہ بندھے ہیں مگر کسی شاعر کے کلام ہی سے اس کے کیرکٹر اور چلن کا اندازہ کر لینا ہرگز صحیح نہیں جیسے کہ آب حیات میں مذکور ہے (بحوالہ صفحہ ۲۱۹) "مشہور کرتے ہیں کہ وہ اصلی اندھے نہ تھے بعض ضرورتوں سے کہ شوخی عمر کا تقاضا ہے اندھے ہو گئے تھے" مگر میر حسن کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جرأت در ایں نوجوانی بسیار بہ حلم و حیا بسر می برد اب درست کیا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ البتہ روسا اور شرفا کے گھروں میں جرأت کا ہر روز آنا جانا ظاہر کرتا ہے کہ وہ ضرور ایک شریف اور نیک چلن آدمی ہوں گے۔ ہاں شوخ طبع اور گانے بجانے میں بھی مشاق تھے۔

آب حیات میں جرأت کا سال وفات ۱۲۲۴ھ لکھا ہے۔ مگر اس کی ایک مثنوی ۱۲۲۴ھ کے بعد بھی لکھی گئی ہے۔ اس کی تاریخ کے شعر سے ۱۲۲۵ھ برآمد ہوتے ہیں ؎

جرأت گیا ہیں فکر میں تاریخ کے جو ہیں
[illegible] خدا [illegible]

۵؎ درد ۱۱۹۹ھ [illegible] تذکرہ [illegible] سال وفات جرأت [illegible]

گو جرأت نے ایسی متعدد مثنویاں تصنیف کی تھیں۔ مگر اس کی غزلوں میں مقطعات بہت زیادہ دلچسپ ہیں۔ جن کا ایک مجموعہ نساخ کے قطعہ منتخب میں درج ہوا ہے۔ جرأت کی یہ غزل بہت اچھی ہے ؎

برنگ مہر ہی گردش ہے ہمکو سارے دن | جو تم پھر آؤ تو پیارے پھریں ہمارے دن
رہے تھا ہم سے ہم آغوش جبکہ وہ پیارا | عجب مزے کی تھیں راتیں عجب تھے پیارے دن
بوصل کیونکہ مبدل ہوں ہجر کے ایام | مگر خدا ہی یہ بگڑے ہوئے سنوارے دن
لگایا روگ جوانی میں کیوں میاں جرأت | ابھی تو کھیل تماشے کے تھے تمہارے دن

شاہ نصیر الدین نصیر۔ تاریخ وفات چراغ گل ہے۔ ان کا باپ شاہ غریب پیری مریدی کیا کرتا تھا۔ وہ گذر گیا تو شاہ نصیر نے میدان شاعری میں قدم رکھا پہلے دوستوں کے مشاعرے میں شریک ہوتے رہے۔ پھر اپنے ہاں ایک مجلس مشاعرہ قائم کی۔ جہاں مہینے میں اول اول ایکبار پھر دو دو دفعہ مشاعرے ہونے لگے۔ ان مشاعروں کے لئے شاہ صاحب حد درجے کی مشکل طرحیں خود ایجاد کرتے تھے۔ جن میں کوئی اچھا شعر کہنا تو کجا؟ غزل کو پورا کرتے ہوئے بھی بڑے بڑے استادوں کی ٹھیک نکل جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ طرح ہوئی قفس کی تیلیاں۔ جرس کی تیلیاں۔ ذوق نے بھی شاہ صاحب کے مشاعرہ میں اسی زمین میں غزل پڑھکر سنائی تو کچھ تکرار ہوگئی۔ جھلا کر بولے کہ اچھا آیندہ سال بھر اس طرح میں بھی غزلیں ہوا کریں۔ شاہ نصیر نے یہ سنکر مشاعرہ آیندہ میں ذوق پر چوٹ کی۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کسواسطے
قافیہ میں گر نہیں حضرت کے بس کی تیلیاں

یہ معاملہ کچھ زیادہ طول کھینچنے لگا - تو شاہ نصیر کے صاحبزادے شاہ میر نے جلتی پہ اور تیل ٹپکایا اور یہ شعر اہل مشاعرہ کو سنایا - جس میں ذوق کی طرف تخاطب کیا گیا تھا ؎

گرچہ قندیل سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھیلچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس سے شاہ صاحب کی مجلس مشاعرہ لڑائی کا گھر بن گئی - اور آخر اسکو بند کرنا پڑا - غرض شاہ نصیر کا سارا کمال مشکل طرحوں میں بہت اچھا شعر کہنا ہے - لیکن آخر کار اس کوہ کندن و کاویہ آوردن سے حاصل ہی کیا - اس سے غزل ناہموار ہو جاتی ہے اور اعجوبہ خیالات سے دماغ پریشان ہو جاتا ہے -

غالباً یہ طرح گردن کی شاخ - نہال سخن کی شاخ بھی شاہ صاحب ہی کی ایجاد کردہ ہے - اس میں ان کا ایک شعر ہے ؎

کہتے ہیں جسکو آہ سو ہے وہ جلی ہوئی
نخلِ امیدِ خشکِ دلِ پر محن کی شاخ

یہاں ایک ساتھ چار اضافتیں استعمال کی گئی ہیں - مگر باوجود اس کے یہ شعر بے لطف نہیں ہوا - اسی زمین میں شاہ صاحب نے ایک قصیدہ بھی اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں کہا تھا - جس میں ذوق کی اس طرح کی غزلوں کے برابر ہی شعر نکالے ہیں مثلاً ؎

ابر کرم سے تیرے ریاض جہاں میں سبز
ہے نخل آرزوئے غریب الوطن کی شاخ
شمشیر وہ تری ہے کہ شق القمر کی طرح

دو ٹکڑے ایک وار میں ہو کر گدن کی شاخ ،
جیفہ کو تیرے دیکھ کے کہتے ہیں جوہری ،
ہم نے کبھی نہ دیکھی تھی لعل یمن کی شاخ ،
صحت کی تیرے سنکے خبر باغ دہر میں ،
پھولی نہیں سماتی نہال چمن کی شاخ ،
دست قضا نے گلشن ہستی میں یوں ہو قطع ،
بدخواہ کی تیرے نفس شعلہ زن کی شاخ ،
رہتی سدا نشانہ تیر و تفنگ ہے ،
جس طرح سے نشیمن زاغ و زغن کی شاخ

شاہ صاحب کی ایک رباعی ہے ؎

کیا خوب کہا دل نے نئی قلیاں کو ۔ سرگرم فغان و شور و فریاد نہ ہو
دم عشق کا کیا بھرتی ہے اے شوخ جواں ۔ آتی ہے ترے منہ سے ابھی دودھ کی بو

یہ شعر کیا بے ساختہ کہا ہے ؎

شاخ گل نازک ہے اے صیاد مت لٹکا قفس
ٹوٹ جائیگی اسیران قفس کے بوجھ سے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی ۔ سال وفات ۱۲۴۰ء یا ۱۲۴۳ھ ہجری ہے مصحفی نے ۸ دیوان نظم اردو کے مرتب کئے ۔ مگر اب شوق سے ایک بھی پڑھا نہیں جاتا ۔ وجہ یہ کہ ان کی طبیعت میں جدت بہت کم تھی ۔ اسیر پرگوئی نے اور بھی ان کے کلام کو عامیانہ بناکر سب کی نظروں سے اوجھل کردیا تھا ۔ مصحفی کا ایک خلاصۂ کلام حسرت موہانی نے شائع کیا ہے اور ان کے حالات آب حیات میں آزاد کے قلم سے بالتفصیل لکھے گئے

ہیں۔ جہاں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آپ کسی سقنی پر عاشق ہو گئے اور اس کی محبت میں یہ قطعہ لکھا ؎

پانی بھرے ہے یار وہ یہ ریشمی دوشالا
لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا
کاندھے پہ مشک لیکر جب قد کو خم کرے ہے
کافر کا نشہ حسن ہو جائے ہے دوبالا
دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں
لنگی کے رنگ سے واں جب تا کمر ہو لالا

مگر میر حسن اپنے تذکرہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ مصحفی نے ایک مثنوی حجام پسر کے لیے بھی تصنیف کی تھی۔ اس میں بھی اپنا وہی عشق جو سقنی سے تھا۔ خوب نمایاں کیا ہے۔ مثلاً ؎

زبس آہستہ رو ہے طفل حجام نہیں بن دیکھے اس کے دل کو آرام
جو دیکھے انگلیاں وہ گوری گوری بنے خورشید پانی کی کٹوری
وہ جھکے روبرو ناگاہ آیا اسے حیرت نے آئینہ بنایا
ملا جب آئینہ کو اس نے تا بنائی بنائی چار ابرو کی صفائی
نہ کھینچے خامہ مو اسکی تمثال کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال
سنے ہی مصحفی اب تو بھی فی الحال منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۱ء میں میاں مصحفی کی ایک مطول مثنوی موسوم بہ بحر المحبت شائع ہوئی ہے اور ان کے قصیدوں اور غزلوں کے نمونے آب حیات میں موجود ہیں۔ غرض ہر صنف کلام میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ ایک تذکرہ شعرا کا میر خلیق کے ایما سے فارسی میں لکھا تھا۔ جس میں میر و سودا کے

سب حالات اپنی آنکھوں دیکھکر لکھے ہیں۔
سید قمرالدین منت ۔ انہوں نے گلستاں کے جواب میں شکرستان لکھی۔ زبان فارسی کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔ ۱۲۰۸ھ میں کلکتے میں انتقال کیا۔ نظام دکن سے ایک قصیدے کا صلہ پانچہزار روپیہ حاصل کیا اور ملک الشعرا بھی قرار دئے گئے۔ ان کا ایک قطعہ ہے ؎

کھڑے رہیئے جو اس کی بزم میں تو لوں لگے کہنے
دکھاتا ہے یہ اپنے پاؤں کیوں ناحق کھڑا رہ بیٹھے
جو اتنی بات سنکر بیٹھ جاؤں تو لگا کہنے
ہنسی سے کہتے ہی اک بات بس اب آپ آ بیٹھے

میر نظام الدین ممنون ۔ سید قمرالدین منت کے فرزند۔ فخرالشعرا کہلاتے تھے۔ شاید حسرت موہانی نے ان کا مختصر کلام بھی طبع کرادیا ہے۔ آب حیات میں میر سودا۔ ذوق۔ جرأت کے کچھ شعر اس غزل کے ایکدوسرے کے بالمقابل قلمبند ہوئے ہیں ؎

برقع کو اٹھا چہرہ سے وہ بت اگر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آئے

اس انداز میں ممنون کا ایک شعر ہے ؎

ہیں نامہ و پیغام سے گذرا کہیں یا رب!
کچھ قاصد بیچارہ کی اپنے خبر آئے

غرض ایک قابل شاعر تھے۔ کتب خانۂ آصفیہ میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی دیوان موجود ہے۔
منشی کرامت علی شہیدی ۔ وفات ۱۲۵۳ھ مصحفی اور نصیر دہلوی

سے مشورہ سخن کرتے تھے انکے کلام میں جدت نام کو بھی نہیں۔ یہ عاشق رسول تھے۔ جب حج کو گئے۔ اور روضہ مبارک کی زیارت ہوئی تو اسی خوشی میں دم دے دیا۔ اس طرح ان کی وہ آرزو پوری ہوئی یعنی ؎

تمنا ہے کہ وہ اڑ کر ترے روضے پہ جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقیدؔ کا

عبد الرحمٰن خان احسان کی ۱۲۶۷ھ ہجری میں وفات پائی۔ حافظ غلام رسول خاں ویران کے بیٹے تھے۔ چونکہ حافظ قرآن تھے۔ شاہ نصیر نے ایک موقع پر ان کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا ؎

اے خالِ رخِ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھکر

اکبر شاہ ثانی نے ان کا قلعے میں آنا جانا اور وظیفہ بند کردیا۔ تو جلکر یہ قطعہ لکھا تھا ؎

ہوں شہِ ہند کا استاد یہ ہے فخر مجھے،
شہرہ میرا تو شہا تا شہِ ایران گیا
عرض غماز پذیرا جو ہوئی حق میں مرے
گیا گیا میرا اگر ان کا ہی ایمان گیا
حکم والا یہ ہوا قلعہ میں احسان نہ ہو
سنکے اس بات کو ہر شخص کا اوسان گیا
ہے شہنشاہ جہاں قدر شناسِ احساں
خلق کہتی گیا کھو بیگی گو خلم کو میں مان گیا
شہر وہ کیا ہے کہ جس شہر میں احسان نہ ہو

قلعہ وہ کیا ہے کہ جس قلعہ بے احسان گیا

نواب الٰہی بخش خاں معروف } فنافی الشہر تھے۔ غالب کے خسر اور ذوق کے حقیقی دوست تھے۔ آزاد کی تحریروں سے پایا جاتا ہے کہ بہادرشاہ ظفر کیطرح معروف بھی ذوق سے شعر لکھوا کر اپنی غزلوں میں داخل کر لیا کرتے تھے۔ یہ امر میری دانست میں صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ معروف تارک الدنیا تھے۔ ان کا شب و روزیہی مشغلہ تھا۔ ہاں ذوق سے اصلاح لیتے ہوں۔ تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں ان کی خاص شاعرانہ قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔
(نمونۂ کلام) غالب کی ایک غزل ہے ؎

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد الخ

نواب صاحب فرماتے ہیں ؎

باغ ہستی میں کھلا گل یہ نیا میرے بعد
غیر سے وہ میرے پھولوں میں ملا میرے بعد

میرزا غالب کا ایک اور مطلع ہے ؎

پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

معروف فرماتے ہیں ؎

جواب خط نہیں دیتا نہ دے جواب تو دے
کہ قاصد آکے جو کچھ دے خبر شتاب تو دے

خواجہ محمد وزیر خاں وزیر ۔ وفات ۱۲۷۰ھ۔ شیخ ناسخ کے شاگرد اور خواجہ آتش کے قدردانوں میں تھے۔ ان کی زبان بغایت رنگین اور لکھنؤ کی نازک خیالیوں۔ استعاروں اور کنایوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ وزیر کی

یہ غزل مشہور خلائق ہے ؎

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہوکر
زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہوکر

ان کا دیوان دفتر فصاحت عموماً مل سکتا ہے۔ ایک اور تصنیف دستور العمل بھی مرتب کی تھی۔

سیّد محمد خاں رند - ولادت ۱۲۱۲ھ وفات ۱۸۵۷ء کے غدر سے کچھ پیشتر ہوئی۔ آتش کے شاگرد اور اس کے ممد و معاون تھے۔ اردو شاعری میں قفس۔ صیاد۔ آب و دانہ۔ گرفتاری وغیرہ کے مضامین ان کا خاص حصہ ہیں۔ ان کے کلام میں ایک شوخی اور تیکھاپن پایا جاتا ہے۔ جو ان کے استاد حضرت آتش کے کلام میں بھی مفقود ہے۔ دیوان رند سب جگہ ملتا ہے۔ اس میں غزلیں نہایت عمدہ زمینوں میں بہر قوافی موجود ہیں۔ خمخانۂ جاوید جلد سوم میں ان کے مفصل حالات درج ہیں۔ ان کی یہ غزل شہرہ آفاق ہے ؎

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیّاد
میں ماجرائے چمن کیا بیاں کروں صیّاد

رند کی یہ غزل آسان بحر و قوافی میں رواں دواں اور مسلسل ہے۔ جس میں کسی دوست کی مفارقت کا حال بیان کیا گیا ہے ؎

ہجر میں تیرے کیا کیا گذری — صدمے گذرے ایذا گذری
گذری جو کچھ جاناں گذری — کیا کہوں تجھ سے حال فرقت
منع کیا کس نے۔ کیا گذری — آئے نہیں تم عرصہ گذرا
شکل حباب و دریا گذری — بحر جہاں میں زیست ہماری
یہ کیا بار خدایا گذری — الفت بت نے کر دیا کافر

مر گئے ہم یہاں واہ ری غفلت ان کو خبر نہ اصلا گذری
کس سے کہیں آہ کون سنیگا کیا کیا گذری۔ کیا کیا گذری
گذرے جبدم ہم دنیا سے ہم نے جانا دنیا گذری
کافر پر بھی نہ گذرے ایسی ہم پر جو بت ترسا گذری
کہتا تھا میں عشق سے باز آ دیکھا جو دل شیدا گذری
ابتو ہے شغل خوں آشامی نوبت جام و مینا گذری
دیکھے حال مریض فرقت حالت ہم پہ مسیحا! گذری،
وقت مرگ یہ جی میں گذرا زندگی اپنی بیجا گذری
ٹوٹ چکا ہے رشتہ الفت یاس ہے ابتو تمنا گذری

ہجر میں کیا کیا صدمے گذرے،
رند کہو دل پر کیا گذری؟

میر وزیر علی صبا - خواجہ آتش کے ممتاز شاگرد تھے - ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا - واجد علیشاہ بادشاہ کے وظیفہ خوار تھے - ان کا دیوان متداول ہے - جس میں یہ شعر آجکل کے ہندو مسلمانوں کی حالت کے عین مطابق ہے ؎

تقریر اختلاف میں کیونکر بڑھے نہیں
ہندو پڑھے نہیں کہ مسلماں پڑھے نہیں

دیوان صبا بھی کلام آتش و رند کا متماثل ہے - ایک قطعہ خوب کہا ہے ؎

دل لگانا عذاب ہوتا ہے آدمی کیا خراب ہوتا ہے
ہونی ہوتی ہے جبکہ بربادی عشق خانہ خراب ہوتا ہے

نواب احمد علیخاں لکھنوی کے ایما سے صبا نے اردو میں ایک شکار نامہ مسمی بہ مثنوی صیدیہ لکھی تھی۔......... شیر کا شکار کرتے - ناگہاں وہ سامنے

سے گزرا تو اس کا سین یوں دکھایا ہے ؎

نظر آیا اس جا پہ وہ شیر نر ۔ نہ چھپے آہوئے چرخ دیکھے اگر
زبردست ایسا کہ ارنی بھی زیر ۔ یہ جرأت کا عالم ہے شیروں پہ شیر
غضب آتا ہے جس طرف جاتا تھا ۔ وہ جنگل تمام اس سے تھرّاتا تھا
جو ترکِ فلک دیکھ پاتا کبھی ۔ تو برجِ اسد میں نہ جاتا کبھی
نظر آئے وہ شیر اگر خواب میں ۔ تو ہاتھوں کی نبضیں غزالی چلیں
ہوا شیر کا سامنا بر محل ۔ چلے ایک ہی بار دونو رفل
پڑیں خوب ہی گولیاں بند پر ۔ جو دل اس نے توڑا تو اسے جگر
شکار اس طرح سے کیا شیر کا
پکارا فلک مرحبا ۔ مرحبا

میر دوست علی خلیل ۔ آتش کے ایک نہایت خدمتگذار شاگرد تھے مگر ان کا کلام بالمقابل اکثر تلامذہ خواجہ صاحب بہت سادہ ۔ عامیانہ اور قدرے پھیکا ہے ۔ فرماتے ہیں ؎

کوئی کیا ادھر سے ادھر لیگیا ۔ نہ ٹوپی بھی اک تاجور لیگیا
بڑا حاصلِ زندگانی ہے یہ ۔ اگر نیک نامی بشر لے گیا
نہ طاقت ہی دل میں نہ صبر و قرار ۔ کوئی لوٹ کر میرا گھر لیگیا
جدائی ہوئی جب سے اندھا ہو میں ۔ وہ آنکھوں سے نورِ نظر لیگیا
برے وقت میں کام آیا وہی
جو حسنِ عمل یہ بشر لے گیا

خواجہ ارشد علیخاں قلق ۔ خواجہ وزیر کے خواہر زادہ اور انہی سے تلمذ تھا ۔ نواب واجد علیشاہ کی مصاحبت میں انکی غزلیں اور ایک مثنوی طلسمِ الفت

بہت شہرت پا چکی ہے۔ ان کا کلام سیر قوافی اور غزلیں رند۔ وزیر اور صبا۔
کی غزلوں سے دست و گریبان معلوم ہوتی ہیں۔ مولینا حالی نے ان کی طلسم الفت
پر اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں بہت اعتراض کیے ہیں۔ مگر اہل دہلی و لکھنؤ کا
مذاق شاعری بالکل جداگانہ ہے۔ کیونکہ لکھنویوں میں نزاکتِ خیال اور رنگینی
کلام کی داد دیجاتی ہے۔ اور شعرائے دہلی عموماً سہل ممتنع اشعار اور حقیقی جذبات
کی قدر کرتے ہیں۔ قلق کو غزل۔ قصیدہ اور مثنوی غرض سب اصناف سخن
پر قدرت حاصل تھی۔ اس کی یہ غزل شاید گراموفون کا ریکارڈ بن چکی ہے ؎

مہندی مل کر میرا ترک ستم ایجاد آیا
خوں بہا ہاتھ میں لیتا ہوا صیاد آیا

ایک غزل بالکل رند کے انداز میں کہی ہے۔ جو قلق کے دیوان مظہر عشق سے
یہاں نقل ہوتی ہے ؎

ابھی چمن میں ہوں آنکھیں نہ بند کر صیاد
حذر کر آہ سے میری خدا سے ڈر صیاد
اُداس کنج قفس ہے چمن بھی ویراں ہے
اجڑ گئے میرے مرتے ہی گھر کے گھر صیاد
وہ زیر دام گیا میں کہ لے نالہ جانکاہ
زمیں پہ بیٹھ گیا دل کو تھام کر صیاد
نکالی بعد فنا خوب حسرتِ پرواز
اڑا رہا ہے چمن میں ہمارے پر صیاد
سنبھل کے نخل گل تر سے آشیانہ اُجاڑ
جو ٹہنی ٹوٹی تو ٹوٹی مری کمر صیاد

دو روزہ عمر قفس میں کٹی کہ گلشن میں
ہر ایک طرح سے ہو جائیگی بسر صیاد
قلق نصیب ہو گیا سیر باغ بے کھٹکے
عدوئے جان ادھر باغباں ادھر صیاد

رباعی

یارب وہ تری فیض رساں ہی درگاہ　پھرتا نہیں محروم کوئی حاجت خواہ
غیروں سے کروں سوال تیرے ہوتے　لاحول ولا قوۃ الا باللہ

قلق نے ۱۸۷۶ء کے بعد قضا کی۔

محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفر } آخری مغلیہ تاجدار دہلی۔ سن ولادت ۱۷۷۵ء اور سال وفات ۱۸۶۲ء ہے۔ پہلے شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ پھر ذوق کے شاگرد ہوئے۔ چونکہ ذوق اول اکبر شاہ ثانی کا ملازم تھا۔ جسکے بعد بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ غالباً ۱۲۵۰ ہجری کو ظفر نے ذوق کا تلمذ اختیار کیا۔ ۱۸۵۷ء میں ایام غدر کے بعد ظفر کو گرفتار کرکے رنگون بھیجدیا گیا تھا۔ وہ اس جگہ بھی شعر و شاعری کرتا رہا۔ ظفر کے چار دیوان ہیں۔ جن میں شاہ نصیر و ذوق .... کے ہمرنگ کلام پایا جاتا ہے۔ ظفر نے اپنے دیوانوں میں پنجابی اور ہندی غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ایک نمونہ پنجابی غزل کا نقل کرتا ہوں ؎

جن گلیاں میں پہلے دیکھی لوگاں کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگاں میں سو فی پڑی وہ گلیاں تھیں
اکھیاں اساؤیاں ڈھونڈن اونہاں ہائے وہ کیتھے لوگ گئے

جن کی نگہ سوں پیاری گلاں لگدی دلکو بھلیاں تھیں،
ایسیاں اکھیاں میچے پڑے ہیں کروٹ بھی نہیں لے سکدے
جنکی چالیں البیلی اور چلنے میں چھل بلبیاں تہیں،،
خاک کا ان کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے،
ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاؤ سی پلیاں تھیں
جانکہے سو آتا نہیں ہے آتا ہے سو جاتا ہے
جب یہ وہ سن پاتے تھے تو پڑتیں کیا کھلبلیاں تھیں
تلخی چکھی موت کی آخر خاک او نہانتوں چاٹ گئی
باتاں جنکی میٹھی میٹھی مصری کی سی ڈلیاں تھیں
روز بہاراں لٹ دے سی او وہ جا جاکے جن لوگوں میں
اب رنگ رہا نہ روپ رہا کچھ پھول جہاں نہ کلیاں تھیں

مفتی صدرالدین خان آرزوؔ۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۲۰۴ھ اور وفات ۱۲۸۵ھ ہے۔ تذکرہ خمخانہ جاوید جلد اول میں ان کے حالات مع خلاصہ کلام مندرج ہیں۔ غالب۔ مومن۔ صہبائی۔ ذوق۔ اور شیفتہ وغیرہ کے ہمعصر اور ان کے ساتھ مطارحات کرتے رہتے۔ آرزو عربی فارسی کے جید عالم اور شعر فہمی میں یگانۂ روزگار تھے۔ غالب کو اکثر خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کیونکہ میرزا صاحب کی بے راہ روش کو ایسے خاص لوگ ہی اچھی طرح پہچان سکتے تھے۔ ضعف پیری کے متعلق کیا خوب فرمایا ہے ؎

عشق بازی کا منہ چڑاتا ہے
اب وہ موسم نہیں شباب نہیں

نمونہ کلام

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
ملنا ترا یہ غیر سے ہو بہر مصلحت
ہم کو تو سادگی سے تری یہ گماں نہیں

کامل اس فرقۂ زہاد میں اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

نقشے تو بہت صانع قدرت نے بنائے
ہر بن ناخن نگاہ پھر دہن ایسا کمر ایسی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ - وفات ۱۲۸۶ھ۔ فارسی میں حسرتی تخلص تھا۔ اردو و فارسی دونوں میں اچھا شعر کہتے تھے۔ حالی ان کے شاگرد تھے۔ انہوں نے مومن سے اصلاح لی۔ تذکرہ گلشن بیخار ۱۲۵۰ھ میں مرتب کیا۔ جس کے متعلق انتخاب زریں میں لکھا ہے۔ کہ اردو زبان کا یہ پہلا تذکرہ ہے۔ جس میں شعرا کے کلام پر آزادانہ رائے دی گئی ہے شیفتہ کا کلیات چھپ چکا ہے۔ ان کا فارسی کلام بھی طبع ہو چکا ہے۔
قطعہ شیفتہ ۔

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز
تلون سے ہے تمکو مدعا کیا،
کبھی مجھ پر عتاب بے سبب کیوں

کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا
کبھی تمکین صولت آفریں کیوں
کبھی الطافِ جرأت آزما کیا
کبھی وہ طعنہ ہائے جانگزا کیوں
کبھی یہ غمزہ ہائے جانفزا کیا
کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی
کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا
کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا
کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں خطا کیا
کبھی اس دشمنی پر حسرت آگیں
پے ہم جلوہ ہائے دلربا کیا
یہ سب طول اس نے سنکر بے تکلف
جواب ایک مختصر مجھ کو دیا کیا
ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

نواب حسام الدولہ فقیر محمد گویا - انتقال ۱۲۶۶ھ - ناسخ کے شاگرد نہایت نازک خیال شاعر تھے - صاحب ثروت ہونے کے باعث شعرا کو مالی امداد بہم پہنچایا کرتے تھے - اپنے تخلص کی رعایت سے فرماتے ہیں ؎

وہ ایسا نہیں چپ رہے بات سُنکر
کوئی اور ہووے گا گویا نہ ہو گا

گویا نے صنعتِ ایہام کو بلا تکلف و آورد بہت اچھی طرح برتا ہے مثالیں

ے چشم بیمار نے ہمیں مارا — مردم آزار نے ہمیں مارا
تھا جو افتادگی شعار اپنا — نہ زمیں سے اٹھا غبار اپنا
بار عصیاں سر پہ ہے گویا بہت — کیا اٹھائیں سر جھکے جاتے ہیں ہم
نظارۂ رخ ساقی سے مجھکو مستی ہے — یہ آفتاب پرستی ہے مے پرستی ہے
بس ایک رات کا مہماں چراغ ہستی ہے — سرہانے روئیگی اب شمع گور ہنستی ہے
یہ بے ثبات بہار ریاض ہستی ہے — کلی جو چٹکی تو ہستی پہ اپنی ہنستی ہے

سید آغا حسن امانتؔ رضوی

ولادت سنہ ۱۲۳۱ھ وفات سنہ ۱۲۷۵ھ - ابتدا میں میاں دلگیر سے اصلاح لی - ایک واسوخت اور اندر سبھا امانت ان کی شہرہ آفاق تصانیف ہیں - ان کے کلام میں رعایت لفظی ضلع جگت اور ایہام بکثرت پایا جاتا ہے - اندر سبھا کی بدولت یہ موجودہ اردو ڈراما کے موجد متصور ہوتے ہیں - دیوان امانت بھی رائج ہے - یہ شعر امانت ہی کے ہیں ے عشق کا خنجر لگا ہے دل پہ کاری اندنوں
زخم کی صورت ہے خوں آنکھوں سے جاری اندنوں

ے مرتا ہوں تیرے ہجر میں اے یار خبر لے
اب جان سے جاتا ہے یہ بیمار خبر لے

تذکرہ خمخانہ جاوید جلد اول میں ان کا مفصل حال لکھا ہے - ضلع جگت کی مثالیں ے
شیریں لبوں کے عشق میں ہے تلخ زندگی — الفت کی چاشنی کا امانت مزا ہے یہ
خال زیر زلف پر مرغ دل عاشق ہے لوٹ — صید کی پھر کیا کمی جس دام میں یہ دانہ ہو
تصور چاہیے ہر صبح اس کے مصحف رخ کا — سحر کے وقت بہتر ہے جو قرآں کی تلاوت ہو

سرمہ کا دنبالہ ہو مشاطہ چشم یار میں
ہے نشتر در کار دست مردم بیمار میں

میر علی اوسط فیض آبادی رشک ناسخ کے شاگرد تھے بسنہ ۱۲۸۴ھ میں ستر سال کی عمر پا کر فوت ہوئے انہوں نے اردو زبان کے محاورات اور متروکات کی بیحد تحقیق کی۔ چنانچہ تخلیص معلّے میں حضرت کلب حسین خاں نادر فرماتے ہیں اس پچاس ساٹھ برس کے زمانے میں صفائی سخن پہ از گوہر آبدار ہوئی جس کی ہر ایک کو پیروی اور تقلید ملحوظ رہی خصوصاً بعد وفات جناب ناسخ مرحوم و مغفور حضرت سید علی اوسط رشک۔ خواجہ وزیر مرزا محمد رضا برق اور شیخ امداد علی بحر کہ ہر ایک ان میں سے سخنور یگانہ اور بے مثل زمانہ ہے۔ بڑے صاحب تدقیق و اہل استعداد بالتحقیق ہیں۔ میر اوسط نے ایک لغت بنام نفس اللغتہ سنہ ۱۲۵۶ھ میں مرتب کیا تھا۔ جو محسن مرحوم کے خلف الرشید نیر کاکوری نے حال میں دوبارہ شائع کیا ہے (بحوالہ معارف دسمبر ۱۹۲۱ء) مؤلف خمخانہ جاوید کا قول ہے کہ کلام رشک کا بیشتر حصہ خشک کلامی اور بدمذاقی کے عیب سے پاک نہیں ہے۔ میری رائے میں اس کا سبب شاعرانہ اصطلاحات اور محاورات کا بے ضرورت استعمال ہے۔ اشعار میں غرابت الفاظ کا عیب بہت نمایاں ہے مثلاً آرسی خورشید محشر کی تو اب جانبی بات چھوڑنے نکل اڑانا اب طلوع حسن ہے + اہل لکھنؤ لفظ کو نقطین (موئنث) بھی باندھتے ہیں رشک سے وصل کی رات بتا نامہ شوق لکھو۔ شام لفظین میں سفیدی سحر کا غذ کی ان کے کلام میں ایہام بالعموم پایا جاتا ہے۔ رشک کے دو دیوان موسوم بہ نظم مبارک و نظم گرامی چھپ چکے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

پتھر کسی کا دل ہے کیسا کا دل آئینہ ٭ ششدر رہوں کارخانۂ پروردگار کا

سیب کا پوست ہے وہ جسلد ذقن

جلد پستاں انار کا چھلکو ہا

بحرِ دنیا کی نہایت کا نہیں کھُل بیڑا
کشتیِ عمر جدھر جائے اُدھر جانے دو

شہاب الدین خان ثاقبؔ۔ خلف الرشید نواب ضیاء الدین خاں نیرؔ درخشاں رئیس لوہارو۔ وفات ۱۲۸۶ھ۔ دہلی کے نامور رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ میرزا غالب کے رشتہ میں بھتیجے اور شاگرد رشید تھے۔ انتیس برس کی عمر میں وفات پائی مگر باوجود اس کے غزلیں بہت صاف اور سلیس کہی ہیں (ملاحظہ ہو خمخانۂ جاوید جلد دوم) فغان دہلی نامی ایک مجموعۂ نظم میں ان کا ایک شہر آشوب درج ہوا ہے ؎

اے کہن سال فلک دشمن جانِ دہلی ✤ کیا ترے ہاتھ لگا کھو کے نشانِ دہلی
حیف صد حیف کھدی شاہجہانی تعمیر ✤ وائے صد وائے مٹی شوکت و شانِ دہلی
چاندنی چوک رہا نہ قلعہ پھر کیونکر ✤ دلی والوں کو ہو جنت پہ گمانِ دہلی
اس کے ویرانے سے آباد ہوئی اور بلاد ✤ ہے بہارِ چمن و ہر خزانِ دہلی

اس نظم میں کچھ آگے یہ اشعار لکھے ہیں ؎

پھر وہی مسجد جامع کے ہی بازار کی دُھوم ✤ پھر ہے آراستہ ہر ایک مکانِ دہلی
پاس مسجد کے شفاخانہ ہی ایسا کہ جسے ✤ ہے بجا کہئے اگر روحِ روانِ دہلی
قلعہ میں ہے وہ پریزادِ عجائب خانہ ✤ کہ صنم خانۂ چیں ہے نگرانِ دہلی
چاندنی چوک مگر گھر بنا از سرِ نو ✤ کہ کہینگے اسی ہم بختِ جوانِ دہلی
قلعہ کے باغ میں وہ رنگ ہے آرائش کا ✤ کہ قسم کھاتا ہی فردوس بجانِ دہلی
اہل ایران یہ غزل سنکے کہینگے ثاقبؔ ✤ بود ثاقب مگر از اہل زبانِ دہلی

حکیم آغا جان عیش - شاہی طبیب تھے۔ ذوق سے ہم طرح غزلیں مشاعروں میں پڑھی ہیں (آب حیات ص۴۹۹) میں ان کا کچھ حال آزاد نے لکھا ہے ان کے خاندان کے کچھ لوگ دہلی میں موجود ہیں۔ جن کے پاس حکیم صاحب موصوف کا قلمی دیوان ہے۔ فغانِ دہلی میں ان کے متعدد شہر آشوب درج ہوئے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے ؎

مل گئی خاک میں شانِ دہلی ٭ نہ رہا نام و نشانِ دہلی
نہیں برباد ہوا کوئی مکاں ٭ آہ دنیا میں بشانِ دہلی
ہو گیا کیا کہوں پامالِ ستم ٭ ہائے ہر اک مکانِ دہلی
کیا ہوا فائدہ اے چرخ تجھے ٭ پیس بنا کر کے زیانِ دہلی
دشتِ غربت میں پھریں چھانتی خاک ٭ یوں بس اب پیر و جوانِ دہلی
گردِ کلفت ہوئی افسوس افسوس ٭ غازۂ ماہ رخانِ دہلی
شان و شوکت ہوئی ان کی برباد ٭ جن سے تھی شوکت و شانِ دہلی
دوسرا گلشن دنیا میں چمن ٭ نہیں سرسبز بشانِ دہلی
سو وہ ایسا ہوا برباد کہ ہیں ٭ بلبلیں مرثیہ خوانِ دہلی
تخلبندِ چمن دہر کو کیا ٭ ناپسند آئی تھی آنِ دہلی
قمریاں کرتی ہیں کو کو غم میں ٭ کر کے اصلاح بیانِ دہلی
مل گئے خاک میں کیسے کیسے ٭ اے فلک سرو قدانِ دہلی
عندلیبانِ چمن ہیں نالاں ٭ یاد کر غنچہ لبانِ دہلی
پہنی سوسن نے ہے نیلی پوشاک ٭ کھا کے غم ماتمیانِ دہلی

پیچ کھاتی ہے یہ سنبل کر یاد ؛ زلف پر پیچ بستانِ دہلی
لالہ ہو داغ یہ دل کرتا ہے ؛ یاد خالِ پریانِ دہلی
یاد کر کر کے ہے حیراں نرگس ؛ نگہہ خوش نگہانِ دہلی
گل کھلایا یہ نیا عالم میں ؛ بل بے نیرنگ خزانِ دہلی
اب کہاں ہے وہ کلام شیریں ؛ ہے کہاں اب وہ زبانِ دہلی
پیشہ ور ایسے کہاں ہیں پیدا ؛ جیسے تھے پیشہ ورانِ دہلی
مل گئے خاک ہیں سب اہلِ کمال ؛ مر مٹے قاعدہ دانِ دہلی
الغرض چرخِ جفاکار نے آہ ؛ خوانِ یغما کیا خوانِ دہلی

دل بھرا آتا ہے خاموش ہو عیش
تجھ سے سُن سُن کے بیانِ دہلی

ایک شہر آشوب ہیں دہلی اور لکھنؤ دونوں کا نوحہ حکیم صاحب کے قلم سے نظم ہوا ہے

ہو گیا ویران دہلی و دیار لکھنؤ ؛ اب کہاں وہ لطفِ دہلی وہ بہار لکھنؤ
باغ دہلی تو ہوا یوں یک قلم برباد آہ ؛ مل گیا سب خاک ہیں نقش و نگار لکھنؤ
جو تھے دہلی میں عمائد وہ گئے یکسر خراب ؛ اور تباہ سارے گئے صاحب وقار لکھنؤ
غم میں دہلی کے گلوں کے تو گریباں چاک ہیں ؛ اور سوسن ہے چمن میں سوگوار لکھنؤ

ٹکڑے ہوتا جگر دہلی کے صدمے سنکے عیش
اور دل پھٹتا ہے سنکر حال زار لکھنؤ

نواب میرزا محمد تقی خان ہوسؔ۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔۔۔۔۔۔۔

ان کا مختصر دیوان مولانا حسرت نے شائع کر دیا ہے مگر زیادہ تر قصہ لیلی و مجنوں کی تصنیف نے ان کے نام کو شہرت دلائی ہے۔ اس مثنوی میں دوسری جنگِ نوفل کے متعلق جو اس نے سرکائے لیلہ سے کی تھی یہ شعر لکھے ہیں

کرتا ہے بقصد جنگ ثانی ٭ یوں توسن خامہ خوش بیانی
یعنی کر جمع فوج نوفل ٭ لگتا تھا جسے نہ دل نہ بادل
آیا جو شکوہ و دبدبے سے ٭ کانپ اٹھی زمین زلزلے سے
سالار قبیلہ ہو کے مضطر ٭ آیا سرِ بام رُو بہ منظر
کیا دیکھا کہ اک گھٹا اٹھی ہے ٭ امڈا ہے جہاں بلا اٹھی ہے
صحرا نیزوں سے ہے نیستاں ٭ شیران سپہ ہیں اسمیں غرّاں
ہم کوس کی ہے صدا جگر دوز ٭ ہم نعرہ کرّنا گلو سوز
کر جلدی سے جمع واں قبائل ٭ آیا وہ حریف کے مقابل
بازار نبرد بھر ہوا گرم ٭ اس درجہ کہ ہو گئی ہوا گرم
پتھر پہ لگا جو زخم کاری ٭ تھا سنگ سے خونِ لعل جاری
شانوں سے گذر کے رمح چالاک ٭ تھی ہوش ربائے مار ضحاک
نیزوں سے زرہ جو چھن گئی تھی ٭ غربال قبا بھی بن گئی تھی
تھی چہروں پہ جنکے گردِ تغیر ٭ دھوتے تھے انہیں باب شمشیر
کوشش ہوئی جب وصف میں افزوں ٭ پھرتا تھا عناں گستہ مجنوں
جو خصم پہ ذرہمی سی آئی ٭ نوفل نے وہ فتح کی لڑائی

کشتوں پہ زلبکہ کشتے تھے واں
لاشوں کے ہزاروں پشتے تھے واں

تذکرۂ آب بقا میں مرقوم ہے کہ آپ پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ لیکن میر تقی میر لکھنؤ میں آئے اور ان کی شاعری کے ڈنکے بجنے لگے۔ تو مرزا محمد تقی نے اپنا تخلص ہوس رکھ لیا۔ اور یہ شعر کہا ؎

سنکر ہوس کے شعر کو اس شوخ نے کہا
کچھ آگے نام اور تھا یہ نام اب ہوا

اسی طرح کی ایک روایت آب حیات میں درج ہے کہ سوز بھی پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ جب میر تقی مرحوم میر کے تخلص سے عالمگیر ہوئے۔ تو انہوں نے سوز اختیار کیا۔ چنانچہ ایک شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف!
اب جو کہے ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو!

حکیم تصدق حسین خان شوق ۔ ۱۲۸۸ھ میں وفات پائی۔ خنجر عشق زہر عشق۔ بہار عشق۔ فریب عشق اور لذت عشق ان پانچوں مثنویوں کے مصنف ہیں۔ مولنا حالی نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں ان مثنویوں کے مطالعہ کی خاص تاکید کی ہے۔ اگرچہ زہر عشق۔ بہار عشق اور لذت عشق مخرب اخلاق ہیں مگر مولانا حالی کے اس قول سے میں متفق نہیں ہوں کہ فریب عشق[1] بھی ان تینوں مثنویوں کی طرح سراسر انمورل یا مخرب اخلاق ہے۔ مثنوی خنجر عشق۔ بالکل سوقیانہ معلوم ہوتی ہے یہ شاید ان کی ابتدائی مشق ہوگی۔ ان کی بہترین

[1] فریب عشق ایک رئیس زادی کے اغوا کا تقریباً سچا قصہ ہے

مثنوی بلحاظ زبان زہرِ عشق ہے ۔ جو ہر جگہ دستیاب ہے اس لئے نمونہ کلام کے اشعار حذف کئے جاتے ہیں ۔

میرزا حاتم علی بیگ مہرؔ قزلباش ۔ تذکرہ آبِ بقا میں ان کا مفصل حال مرقوم ہے ۔ سال ولادت ۱۲۳۰ھ وفات ۱۲۹۶ھ یہ ناسخ کے ایک شاگرد تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

میرا استاد کامل مہر ناسخ سا سخنداں ہے

غالب کے عزیز دوست تھے ۔ ان کے نام غالب کے متعدد خطوط عود ہندی میں نقل کئے گئے ہیں ۔ تاریخیں بہت اچھی نکالتے تھے ۔ مثلاً ناسخ کی تاریخ انتقال انہی کے ایک مقطع کے مصرعہ سے نکالی ہے ؎

تاریخ ازل سے بندۂ شاہ حجاز ہے

یعنی ۱۲۵۴ھ ۔ مہر صاحب آگرہ میں وکالت کیا کرتے تھے ۔ اسقدر رحم دل تھے کہ جو لوگ باہر سے اپیل کرنے آتے اور ان کو اپنا وکیل گردانتے تو وہ اگر ضرورت پڑتی اپنے گھر میں موکلوں کو رہنے کی اجازت دیتے انکو کھانا کھلاتے اور پھر واپسی کے ٹکٹ کے دام بھی ادا کر دیتے تھے ۔ وہ کچھ دنوں آنری مجسٹریٹ بھی رہے تھے ۔

ان کا دیوان خیالات مہر طبع ہو چکا ہے ۔ اس کے علاوہ کئی مثنویاں اور مختلف تصنیفیں بھی ان سے یادگار ہیں ۔

میرزا حاتم علی مہر نے حافظ کے ایک شعر کی تضمین کی ہے ؎

ہیں اپنے وقت کا حاتم ہوں حاتم کیا تھا بیچارا ٭ میرے دستِ کرم کو دیتے ہیں قیصر و دارا

نہیں کچھ حصر اسپر کہ دوں ہندوستاں سارا اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

قطعہ

پری زیان بہ سیمائے متھرا ٭ چھٹے اسے دہر ہم سے ہائے متھرا
بتوں سے کہیو میری یاد اللہ ٭ اگر باد صبا تو جائے متھرا
نشور تبھی گر جذب دل سے
ہمارے پاس دوڑی آئے متھرا

میرزا قربان علی بیگ سالک ۔ وفات ۱۹۰۳ء پہلے مومن سے پھر غالب سے اصلاح لی ۔ ان کا دیوان مخار سالک ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا ۔ تو مولانا حالی نے تقریظ لکھی تھی ۔ آپ ریاست الور میں وکیل تھے ۔ مرزا غالب نے ان کے اس شعر کو بہت پسند کیا تھا

تنگدستی اگر نہ ہو سالک ٭ تندرستی ہزار نعمت ہے

جسطرح غالب نے ایک چھالیا لینے کو یہ قطعہ فی البدیہ کہا تھا

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی ٭ زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

سالک کی ایک نظم لال مرچ کے متعلق اسی طرح کی دیوان مذکور میں درج ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں

فلفل سرخ بھی ہے خوان زمیں پر اک چیز
اس کی تعریف میں جو کچھ کہ ہے شایاں کہیے
لب ہاں خوردہ معشوق سے نسبت دیجیے

سر انگشت حنا بستۂ خوباں کہیے
سبزہ رنگی میں سزاوار ہے جو کیجیے فرض
سبز فولاد کا نو ساختہ پیکاں کہیے
سرخ رنگی میں نہ کہیے کہ اسے کیا لکھیے
خنجر تر شدۂ خون شہیداں کہیے
سرنگوں شاخ ہیں۔ ہے مثل حیا مندوں کی
ہاتھ آجائے تو اک شوخ ستمراں کہیے
دانت رکھتے ہیں بہت اسپہ حریفان جہاں
اس کو ہم لذتِ بوس لب جاناں کہیے
دیکھیے گر ہاتھ پہ دو تین اٹھا کر سالک
ہاتھ کو رشک دہ پنجۂ مرجاں کہیے

ان کی ایک رباعی ہے ؎

ابنائے زمانہ پر جو کی خوب نگاہ احساں کبھی کریں تو سو کر کے گواہ
ہم سے بھی چھپا کے جو ہمیں دیتا ہو سالک نہیں کوئی ایسا لیکن اللہ

تدبیر الدولہ مدبر الملک سید مظفر علی خاں اسیر۔ امیٹھی لکھنؤ کے باشندہ تھے۔ نصیر الدین حیدر۔ امجد علی شاہ اور واجد علیشاہ سب کا زمانہ دیکھا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں ۸۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔ چھ دیوان اور مختلف تصنیفات یادگار ہیں۔ ان کے مفصل حالات جلد اول خمخانۂ جاوید میں ملاحظہ فرمائیں۔ امیر مینائی انہی کے ارشد تلامذہ ہیں۔ اشعار ؎

بسر کی ابتدا و انتہائے عمر ماتم میں ؎ محرم میں ہوئے پیدا قضا آئی محرم میں

زمانہ رنج دیتا ہے بقدر حال انساں کو ؛ گدا کو فکر ناں اندیشہ عالم ہی سلطاں کو
صبر کی لذت اگر طبع گدا پیدا کرلے ؛ خشک روٹی نانِ نعمت کا مزا پیدا کرلے
ایک کیا ایسے جو سو عالم خدا پیدا کرے ؛ غیر ممکن ہی کہ تجھ سا دوسرا پیدا کرے
کہنے کو یوں جہاں ہیں ہزاروں ہیں یار دوست ؛ مشکل کے وقت ایک ہی پروردگار دوست

نواب محمد یوسف علی خاں ناظم فرمانروائے ریاست رامپور۔

وفات ۱۲۸۲ھ دلی بگڑ کر شعرائے اردو کا جھمگٹ لکھنؤ میں ہوا تھا۔ مگر نواب واجد علیشاہ کے بعد شعرائے دہلی و لکھنؤ رامپور چلے گئے تھے۔ جہاں نواب صاحب موصوف نے انکی خوب قدر کی چنانچہ میرزا غالب۔ اسیر۔ امیر مینائی۔ داغ جلال وغیرہ دہلی و لکھنؤ سے منہ موڑ کر فرمانروایانِ رامپور ہی کے وظیفہ خوار رہے تھے۔ لیکن رامپور کی ان قدردانیوں کے بعد غزلگو شعرا حیدرآباد دکن کی طرف جھکے پھر نواب مرزا داغ کی وفات کے بعد ان کا یہ ٹھکانا بھی جاتا رہا تو اردو گو شعرا تمام اطراف ہندوستان میں منتشر ہو گئے۔ اس لئے یہ سلسلہ تذکرہ یہیں ختم کیا جاتا ہے۔ امیر مینائی۔ داغ۔ جلال اور مرثیہ گو شعرا میں ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ دلگیر۔ اور انس۔ مونس۔ انیس و دبیر وغیرہ کے حالات جنکی کوششوں کے ادبی نتائج ہمارے زمانے میں بار آور ہوئے۔ آئندہ اس کتاب کے حصہ دوم میں درج ہونگے۔ نواب صاحب موصوف ناظم رامپوری کا دیوان عرصہ ہوا چھپ چکا ہے آپ فرماتے ہیں ۔

ناظم اگرچہ میر بھی تھا خوش سخن مگر
ہے ہمکو شیوہ اسداللہ خاں پسند

اس شعر میں ریاست رامپور کی قدردانیوں کیطرف اشارہ کیا ہے ۔

شعر کا چرچا ہے اور شاعر کی قدر
خوش ہوئے ناظم کے ہم دربار سے

ایک رباعی میں ماہ رمضان سے مخاطب ہو کر کہا ہے ؎

یہاں کال سے ہے طرح طرح کی تکلیف ÷ فاقوں سے ہوئے ہیں آدمی زار و نحیف
اس سال میں یا حضرت ماہ رمضاں ÷ حاجت کیا تھی کہ آپ لائے تشریف

یہ رباعی مرزا غالب ہی کی جدت طبع معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایک رباعی کا یہ مضمون ہے ؎ روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

بعد غدر مسلمان جب انگریزوں سے مانوس ہو گئے اور انگریزی کونسلوں میں جانے لگے تو ناظم صاحب نے فرمایا ؎

خلافت کی بنا اجماع پر ہے واقعی ناظم
اسی رو سے ہوئی لازم ہمیں طاعت یہ کونسل کی

نواب کلب علیخاں خلد آشیاں نواب یوسف علیخاں والئے ریاست رامپور کے فرزند تھے امیر مینائی سے تلمذ تھا۔ شعرا کے بڑے قدر دان تھے۔ (مفصل حالات تذکرہ آب بقا میں لکھے ہیں) ان کی وفات کے بعد غزل گو شعرا کا جمگھٹ حیدر آباد دکن کی طرف منتقل ہو گیا۔ کیا خوب کہا ہے۔ ؎

دیوانہ گر کہیں گے تو مجکو کہیں گے لوگ ÷ تم کیوں ہو مضطرب مجھے بیتاب دیکھکر

نواب میر محبوب علیخاں نظام الملک آصف جاہ والئے دکن ۱۸۶۹ء میں گدی نشین ہوے۔ غزل گو شعرا کے آخری قدر دان تھے جو داغ سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔ حضرت داغ اور میاں مجروح کی وفات پر دہلی اور لکھنؤ میں قسم عشقیہ شاعری کا چراغ گل ہو گیا۔ اور مولانا حالی کا قول سچا ثابت ہوا ؎

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں ÷ نہ سنیگا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

ضمیمہ نمبر ۲

فہرست دواوین اشعار و مختلف منظوم تصنیفات بہ شمولیت کتب محاورہ و لغات معانی و بیان و قواعد زبان وغیرہ کہ جنکا مطالعہ اردو شعرا کیلئے ازبس ضروری ہی اور عام شائقین زبان و نظم اردو کیلئے موجب دلچسپی ہے اگرچہ مولینا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں صرف متعدد دواوین شعراء پر عبور کرنا ضروریات شاعری میں داخل سمجھا گیا ہی مگر موجودہ اخلاقی و نیچرل شاعری کے تصنیف کرنیمیں اس سے زیادہ ادبی مواد کی ضرورت ہی لہٰذا بطور مشورہ شعرا کتب ذیل انتخاب کی گئی ہیں ؛

فرہنگ آصفیہ (مؤلفہ سید احمد دہلوی) یہ نایاب ہے مگر بعض کتبخانوں میں ابتک موجود ہی امیر اللغات (مولفہ امیر مینائی) ۔ یہ شعراء کے لئے ازبس مفید ہے۔ سرمایۂ زبان اردو (مولفہ ضامن علی جلال - اردو لغات فیروزی (دو جلد) اسکو پنجاب یونیورسٹی نے عام طلبا کے لئے پسند فرمایا ہی نفائس اللغات - مولوی اوحد الدین اربعۂ عناصر - مرتبہ مولوی محمد ناصر علی صاحب امان اللغات مولفہ امان الحق - قرار اللغات - قرار اصطلاحات - قرار المحاورات مولفہ سید تصدیق حسین صاحب رسالہ تذکیر و تانیث موسوم بہ مفید الشعرا مولفہ سید ضامن علی جلال - قرآن السعدین (رسالہ تذکر و تانیث) مولفہ راجہ راجیسور راؤ صاحب اصغر باغ حیدر آباد دکن فرہنگ شفق (اللتاپرشاد) قواعد اردو مولفہ مولوی عبد الحق صاحب جسکے ساتھ تنقید قواعد اردو مذکور

رسالہ تذکیر و تانیث (ضمیر بانگرامی)

مؤلفہ عبد الغنی صاحب بھی ضرور مطالعہ کرنا چاہئیے۔ قواعد اردو موسوم مصباح الفوائد
مؤلفہ مولوی فتح محمد صاحب جالندہری اصلاح زبان اردو مؤلفہ جناب عشرت لکھنوی
دریائے لطافت۔ مصنفہ سید انشاء اللہ خان۔ نفس اللغت (رشک)

(علم عروض و بیان و معانی و بدیع)
شاعری کی پہلی دوسری تیسری کتاب۔ تالیفات جناب عشرت لکھنوی۔
حدائق البلاغۃ (اردو ترجمہ) معیار البلاغۃ مؤلفہ منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی
تذکرۃ البلاغۃ۔ مؤلفہ مولوی ذو الفقار علی صاحب سہارنپوری۔ مولانا حالی کا
مقدمہ دیوان ۔ موازنۂ انیس و دبیر شبلی۔ چراغ سخن (یاس لکھنوی)۔
اردو شاعری مؤلفہ علوی صاحب۔ تسہیل البلاغۃ۔ مؤلفہ جناب سجاد مرزا بیگ
صاحب دہلوی۔ کاشف الحقائق (امداد علی) بحر الفصاحت مؤلفہ نجم الغنی رامپوری
مشاطۂ سخن (مؤلفہ منشی صفدر مرزاپوری) شرح دیوان غالب (طباطبائی)
شرح دیوان غالب (آسی لکھنوی)۔ دستور الشعراء (اشرف) نجم الامثال

(تصنیفات مولانا محمد حسین آزاد)
تذکرۂ آب حیات۔ سخندانِ فارس۔ نگارستانِ فارس۔ نیرنگ خیال (دو حصے)
دیوان ذوق۔ مجموعہ نظم آزاد۔ مکتوبات آزاد۔ دربار اکبری۔

(تصنیفات و تالیفات مولانا حالی)
دیوان حالی مکمل۔ یادگار غالب۔ حیات سعدی۔ مناجات بیوہ۔ برکھا رت
چہار گلزار حالی۔ مجموعہ نظم حالی۔ مسدس حالی مع ضمیمہ۔ تحفۃ الاخوان
حب وطن۔ شکوہ ہند۔ پیام حالی۔ چپ کی داد۔ جواہرات حالی۔
کلیات اسمعیل میرٹھی۔ روح ادب (جوش ملیح آبادی) جذبات فطرت
قومی نظم (راشہری) سبعہ سیارہ و جذبات (راج بیاری) ہمارا طرز حکومت (سید محمد)

(تصنیفات مولانا شبلی)
شعر العجم ۵ حصے۔ مجموعہ کلام شبلی اردو۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ سیرۃ مولانا روم
مولانا شبلی کی فارسی نظمیں اور مجموعہ مضامین شبلی۔ مکاتیب شبلی۔

کلیات اکبر حصہ اول۔ دوم۔ سوم۔ خطوط اکبر۔ مکاتیب اکبر ۶ نظم الہام

۵ پروفیسر ناگپور کالج۔ ۶ امداد امام متخلص اثر

مکمل ترانہ - نالۂ یتیم - فریاد امت - شکوہ - جواب شکوہ - اکبری اقبال - بلال -
شمع و شاعر - خضر راہ - طلوع اسلام - تصویر درد - مثنوی اسرار خودی - رموز بیخودی -
پیام مشرق - (کلام مظہری احمد شفیع بی۔ اے) حسن تخیل (ارشد تھانوی)
خیالی محفل - تصویر یتیمی - اخوت - ندائے غیب - خیرات میرا خواب - تصویر نادار
ہمارا خدا - ہمارا رسول - ہمارا قرآن (تضمین ارشد) - مخمس علی تسلیم
پیکر نور - ایثار مسلم - دربار رسول - قبلہ نما - نعرۂ توحید - ستاروں کا گیت
خطاب بہ مسلم -

ص

مرثیہ سرسید احمد (اردو) اخوت - جوگی اور ناظر - لموودری کشم
خیالات شہباز - کلیات نظیر اکبر آبادی - زندگانی بےنظیر
کلام نیرنگ - پیغام عمل - فریاد جرمن - آہنگ عمل - شرار زندگی - نوائے انقلاب
درد پنہاں - نظم بے نظیر (نذیر احمد) شمع سخن (پروفیسر نواب علی)
خنجر عشق - بہار عشق - لذت عشق - فریب عشق - زہر عشق - خیابان [illegible] شرر
مثنوی بدر منیر - مثنوی گلزار نسیم - فریاد داغ - مثنوی مصحفی (مرتبہ انجمن ترقی اردو)
مثنوی لیلیٰ و مجنوں (مصنفہ مرزا محمد تقی ہوس) - درد جانستاں (ناصر نذیر)
عالم خیال - لیل و نہار - مثنوی ترانۂ شوق (احمد علی قدوائی) طلسم الفت (فلق)
مثنوی امید و بیم - مثنوی نو بہار - مثنوی الکلام مصنفہ سید محمد بے نظیر شاہ وارثی)
اردو لشکر - کشوف الثمین - تحسین (نعتیہ کلام محسن کاکوری) - [illegible] چچی کی فریاد
روح ادب - اوراق سحر - جذبات فطرت - چمن بے خزاں (ستارہ)
کلام مخدوم (تین حصے) - درد دل (تین) - کلام احسن (کچھوچھوی) - [illegible]
پیام فلک - جام فلک

موج زمزم ۔ شکریہ یورپ (آغا حشر کاشمیری) اچھے کپڑے (ارشد گورگانی)
تاج حریت ۔ فیضی شاعر ۔ پیکر جذبات (میر احدی اجمیری) اردو کی ڈگی (اشہری)
گلدستہ اردو (اشہری) نالۂ موزون (حکیم اظہر دہلوی) رباعیات انیس و دبیر
جذبات اوج ۔ کلام شبیر (محمد شبیر احمد خاں) نور ایمان (مجموعہ کلام بیدل سہارنپوری)
گور غریباں (عبد الاحد وزیر) فریاد یتیم ۔ مدینے کی کھجور (خلیق دہلوی) اکسیر سخن (شاکر میرٹھی)
رباعیات حافظ (ساکن پہلی بھیت) سائنس و فلسفہ ۔ فلسفہ اخلاق قیمتی زیور (مولوی عبد الحق (?))
قصائد عزیز (مصنف گلکدہ) اوراق گل (قیصر بھوپالی) جذبات نادر حصہ اول و دوم ۔
کلیات محسن کاکوری ۔ جذبات بھاشا (نیاز فتحپوری) جذبات جوہر (مولانا محمد علی صاحب)
سوز بیوہ ۔ دنیا کی اجڑی ہوئی محفل (سرور جہان آبادی) شعلہ طور (غلام محمد طور)
انتخاب جدید (یعنی قومی نظموں کا مجموعہ) تین حصے ۔ قومی ترانے (مرغوب الحسنی (?) لاہور)
لمعات اوج (اوج گیاوی) بیاض ارشد (ارشد تھانوی) مسدس کیفی (برج موہن دتہ)
سلسلہ منتخبات نظم اردو (تین حصے) مرتبہ محمد الیاس برنی ۔ فراق یوسف (میر انیس) +
روایات اسلام (فوق) تاریخی جواہر (اظہر) جذبات حریت ۔ رموز حقیقت (قلندر علی)
تذکرہ خمخانہ جاوید تین حصے (لالہ سری رام) تذکرہ نکات الشعرا (میر تقی)
تذکرہ میر حسن ۔ تذکرہ انتخاب زریں (مؤلفہ سید راس محمود صاحب) المیزان ۔
مرتبہ نظیر الحسن فوق ۔ حیات انیس (اشہری) حیات انیس (احسن صاحب)
ایشیائی شاعری (اشہری) تذکرہ گلدستہ سخن (شعور (?)) واقعات انیس
. . . . ردالموازنہ (مرزا اوج لکھنوی) مباحثہ گلزار نسیم ۔
تذکرہ شعرائے دکن (عبد الجبار) ۔ حیات جاودانی (حسرت موہانی) یادگار داغ
(افسوں اکبرآبادی) ۔ تذکرۃ الشعرا (حسرت موہانی) ۔ فن شاعری (اخر السلطان احمد)

مؤلفہ مہدی حسن

حالات میر درد - حیات داغ و حیات حالی (سید محمد فاروق) مرقع ادب
بزم خیال (صفدر) زندگانی بے نظیر (پروفیسر شہباز) بزم خیال (صفدر مرزاپوری)
تذکرہ گلشن ہند (انجمن ترقی اردو) تذکرہ گلستانِ سخن - تذکرہ گلشن بیخار -
نغمۂ عندلیب یا تذکرہ بہارِ بیخزاں - یادگار امیر مینائی - تذکرہ سراپا سخن -
تذکرۂ سخن شعرا (عبدالغفور نساخ) تذکرہ فکر بلیغ (مرتبہ شاد عظیم آبادی) -
تذکرۂ آثارِ شعرائے ہنود (دیبی پرشاد بشاش) - ہدیہ گوئی (حیدرآباد دکن)
کلیات میر تقی - کلیات سودا - کلیات آتش - دیوان درد - کلیات ناسخ
دیوان ذوق مکمل - دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ) کلیات مومن - دیوان مصحفی
دیوان جرأت - کلیات انشاء اللہ خاں - دیوان سوز - دیوان قائم چاندپوری
دیوان ولی - جواہر خسروی (امیر خسرو کا اردو کلام) دیوان حسرت دہلوی
(مرتبہ حسرت موہانی) دیوان صنم خانۂ عشق - مینائے سخن - دیوان مرآۃ الغیب
(امیر مینائی) دیوان رند - دیوان صبا - دیوان وزیر[1] - دیوان[2] حاتم علی مہر -
دیوان شیفتہ - دیوان رشک - دیوان امداد اثر - گلزار داغ - مہتاب داغ
آفتاب داغ - انتخاب کلیات ظفر - دیوان گلکدۂ عزیز - دیوان مجروح -
دیوان امانت لکھنوی - دیوان ذکی مرادآبادی - غزلیات اردو (مرغوب ایجنسی لاہور)
تیر و نشتر آغا شاعر - دیوان حبیب کنتوری - دیوان انور - دیوان گویا - دیوان مظہر عشق
دیوان ہنجار سالک - دیوان ممنون - کلیات امیر اللہ تسلیم - دیوان ناظم رامپوری -
بہارستان سخن - دیوان بدر کمال - لوریاں (انسٹیٹیوٹ علیگڈھ) مرغوب ایجنسی لاہور

مجموعہ مراثی دلگیر ۴ جلد - مراثی انیس ۵ جلد - مراثی مونس و انس - مراثی ضمیر - مراثی خلیق
مراثی خلق - مراثی مختلف شعرا مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ - واقعات کربلا انیس

[1] یعنی دفتر فصاحت [2] خیالات مہر

ضمیمہ ۲- تصحیح اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
ک	۱۰	دل واغ	دل و دماغ
ل	۱۴	سنہ ۱۸۴۲ء	سنہ ۱۸۴۹ء
و	۱	پراکت	پراکرت
۲	۲	حقیعت	حقیقت
۱۵	۲	ایسا ہی	ایسا بھی
۲۳	۲	ٹپکتا	پٹکتا
۳۶	۸	شعرا ہیں	شعرا ہے
۳۸	۵	ہیں ہی	ہی ہیں
۳۹	۱۳	احمد حسین	خان احمد حسین خاں
۴۰	۱۰	مصروف	مصروف رہے
۴۸	۲	جواہر	جواہرات
۴۹	۲	قوم ہارا	قول ہارا
۵۱	۷	کہ کم	کم
۵۲	۱۱	شہ	شاہ۔
۵۲	۱۳	سب شہر	شہر
۵۴	۴	تو بہت	جو بہت
۶۵	۲	مشاہبیر	مشاہیر

صفحہ	سطر	صحیح	غلط
۷۰	۱۱	بازار شکر	بازار
۷۴	۸	نہیں ہوئی	نہ ہوئی
۷۲	۱۰	پنہاریاں	پسنہاریاں
۸۹	۸	اصل	اصلیت
۹۰	۶	زبان	زبانی
۸۷	۸	لمبی	لمبے
۹۵	۸	میں بھی	بھی
۹۷	۷	خجستہ	خستہ
۱۰۷	۵	لطف	لطیف
۱۳۱	۴	سکتے	سکتے ہیں
۱۵۴	۱۰	مملکت	مملکتِ
۱۵۷	۲	مناسبت	مناسفت
۱۸۸	۱	کہارو	کہاری
۲۰۱	۱۱	مطلع	منقطع
۲۰۲	۱۳	سفیہوں	صفیہوں
۲۱۸	۱۲	کس قدر	کسی قدر
۲۳۹	۱۴	تشبیب	تشیب
۲۴۲	۳	کھدرے سے	کھدرے
۲۴۸	۱۴	آئندہ	آیند
۲۹۲	۱۳	ایکبار الٰہی	الٰہی
۳۰۰	۷	رسما	رسما
۳۲۹	۱۲	اِن کے اشعار	اشعار